Geographical, Cultural, and Social Dimensions of Urdu Seerah writing in the Colonial Era: A Critical Study

نو آبادیاتی عہد کی اردو سیرت نگاری میں جغرافیائی' تہذیبی اور معاشرتی عوامل کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ

Sadia Mumtaz *[1]
PhD Scholar, Department of Urdu,IIU, Islamabad

سعدیہ ممتاز☆[1]
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی ، اسلام آباد

Correspondance: aalikhan765@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 15-01-2026
Accepted:26-03-2026
Online:31-03-2026

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: The colonial context introduced profound transformations in the intellectual and socio-cultural landscape, which significantly influenced Muslim scholarship and literary production. Urdu Seerah writers, responding to both internal reformist impulses and external pressures such as Orientalist critiques and missionary discourse, developed new stylistic and thematic approaches. It highlights the incorporation of rational argumentation, historical consciousness, and socio-religious reform into the narrative framework. The study also explores how these factors led to a shift from traditional, devotional modes of writing to more analytical, critical, and context-aware expressions. By analyzing selected texts, this paper demonstrates that Urdu Seerah writing in the colonial era was not merely a continuation of classical traditions but an adaptive and dynamic response to changing historical circumstances. It played a vital role in articulating Muslim identity and intellectual

resilience in a period marked by colonial dominance and cultural negotiation..

KEYWORDS: Colonialism, Seerah Books, Intellectual, Socio- Cultural Landscape, Orientalist Critiques, Missionary Discourse, Sir Syed Ahmad Khan, Qazi Suleman Salman Purri, Mulana Shibli Naumani, Syed Suleman Nadvi

مشرق اور وہاں کے ماحول سے متعلق معلومات کے حصول کا ایک اہم ذریعہ جغرافیائی علم ہے۔ مشرق سے متعلق تمام علوم میں اس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب Orientalism (شرق شناسی) میں مشرق کے جغرافیہ کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک جغرافیائی معلومات کے حصول سے آبادی کی تقسیم، حدود میں توسیع، مملکتوں کی ترقی اور وہاں کے ذریعہ معاش کے متعلق حقائق تلاش کیے جاسکتے ہیں۔[1] جغرافیہ کا علم کسی بھی خطہ ارض کے متعلق درست معلومات کی فراہمی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

سیرت نگاری میں جغرافیہ کے بیان کو نو آبادیاتی عہد میں اہمیت دی گئی۔ نو آبادیاتی عہد سے قبل اردو سیرت نگاری میں حضور ﷺ کی پیدائش کو زمان و مکان سے جوڑ کر بیان کیا جاتا تھا اور اس میں بھی معجزات کے بیان کو زیادہ ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ نو آبادیاتی صورت حال نے سیرت کے اس پہلو پر اثرات مرتب کیے اور پہلی مرتبہ اردو سیرت نگاروں نے جغرافیہ کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے 'اسے سیرتِ طیبہ کے بیان میں جگہ دی اور سیرت نگاری میں جغرافیہ سیرت کا اہم موضوع بنا۔ جس جغرافیائی ماحول میں رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے اور جہاں انھوں نے اپنی پوری زندگی بسر کی، وہ علاقہ کیا تھا؟ اس کا جغرافیہ کیا تھا؟ اس میں شہر کون سے تھے؟ اس کی آبادی کی تقسیم کیا تھی؟ اس میں تجارتی سرگرمیاں کس نوعیت کی تھیں؟ یہ وہ تمام سوالات ہیں، جن کے جواب نو آبادیاتی عہد میں لکھی جانے والی کتبِ سیرت میں دینے کی کوشش کی گئی۔ اردو سیرت نگاری میں سرسید احمد خان وہ پہلے مصنف ہیں، جنھوں نے عرب کے جغرافیہ کو موضوع بنایا اور اس پر تحقیق کر کے حضور ﷺ کی جائے پیدائش مکہ مکرمہ کو ثابت کیا اور اس ضمن میں مستشرقین کے اعتراضات کا مدلل جواب تحریر کیا۔ سرسید کے بعد ان کے پیش رووں نے اس طرزِ تحریر کو اپنایا اور عرب کے جغرافیہ پر تحقیق کر کے اس کو شاملِ سیرت کرنا اپنا فرضِ اولین تصور کیا۔

اس مقالے میں نو آبادیاتی عہد میں لکھی جانے والی کتبِ سیرت میں جغرافیہ کے ساتھ عرب کا تہذیبی و معاشرتی مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے Orientalism (شرق شناسی) میں لکھا ہے کہ یورپ اپنی تہذیب و تمدن کو مشرق کے مقابلے میں اعلیٰ خیال کرتا ہے اور اپنے اس احساسِ برتری سے وہ مشرق پر حاوی ہونے کی خواہش رکھتا ہے۔[۲] اہلِ یورپ نے برصغیر میں اقتدار قائم کرنے کے بعد مسلم طبقے کو حقیقی معنوں میں اپنا حریف سمجھا اور ان کی انفرادی شناخت کو مٹانے کی حتیٰ المقدور کوشش کی۔ انھوں نے تہذیبی و معاشرتی سطح پر مسلمانوں کو کم تر گردانا اور ان کے مذہب اور نبیؐ کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے سیرتِ نبوی کے تہذیبی و معاشرتی ماحول کو نشانہ بنایا۔ اسی بنا پر نو آبادیاتی عہد کی کتبِ سیرت میں اُس عہد کی عالم گیر جاہلیت کی تصویر کشی کی گئی ہے، جو چھٹی صدی مسیح میں پوری دنیا پر محیط تھی۔ اس سے قبل اردو سیرت نگاری میں اس زمانے کے اخلاقی بگاڑ، انسانی بے چینی اور فطری زوال کا ذکر مفقود تھا۔ نو آبادیاتی عہد میں لکھی جانے والی سیرتوں میں سیرتِ رسول ﷺ کے تہذیبی و معاشرتی ماحول کا خصوصی مطالعہ کیا گیا۔ اس مقالے میں منتخب کتبِ سیرت خطباتِ احمدیہ، رحمۃ للعالمین، سیرۃ النبی ﷺ کی اولین دو جلدوں، خطباتِ مدراس اور سیرت رسول اللہ ﷺ میں جغرافیائی اور تہذیبی و معاشرتی عوامل کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

ا۔ خطباتِ احمدیہ:

سر سید احمد خان نے خطباتِ احمدیہ میں سیرتِ طیبہ کے بیان میں جغرافیہ کی اہمیت کو مدِ نظر رکھا ہے اور اردو زبان میں سیرت میں جغرافیہ کا باقاعدہ بیان سر سید احمد خان کی اسی کتاب سے ہوا ہے۔ یہ کتاب بارہ خطبات پر مشتمل ہے، اس کا پہلا خطبہ "عرب کا جغرافیہ اور عرب قبائل" سیرتِ طیبہ میں جغرافیہ کی اہمیت کو پیش کرتا ہے۔ سر سید احمد خان نے یہ کتاب گو سر ولیم میور کے اعتراضات کے جواب دینے کے لیے لکھی مگر درحقیقت انھوں نے اس کی تصنیف سے سیرت لکھنے کے لیے معیارات کا تعین کر دیا ہے۔ اُس خطہ ارض کے متعلق درست معلومات کا اندراج، جہاں حضورؐ کی پیدائش ہوئی، سیرت نگاروں کے لیے نہایت ضروری ہے تاکہ مسلم و غیر مسلم اس علاقے کے خدوخال اور وہاں مبعوث ہونے والے نبی کو بخوبی جان سکیں۔

سر سید نے عرب کا جغرافیہ لکھتے ہوئے سب سے پہلے اس کی وجہ تسمیہ سے بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ عرب یا جزیرۃ العرب، جو بحرِ احمر کے مشرق کی طرف واقع ہے اور وہاں سے خلیج فارس تک اس کی سرحدیں لگتی ہیں، اس کا نام عرب کب اور کیسے پڑا، اس کے زمانہ کا تعین مشکل ہے لیکن کتاب اول ملوک باب ۱۰ درس ۱۵ میں جہاں ملکہ سبا اور حضرت سلیمانؑ کی ملاقات کا ذکر ہے اس کو ملک عرب کہا گیا ہے۔ یہ نکتہ پیش کرنے کے ساتھ ہی وہ لکھتے ہیں کہ

> "ہماری رائے میں یہ جزیرہ حضرت سلیمانؑ کے زمانہ سے بہت پہلے عرب
> کے نام سے کہلایا جاتا تھا کیوں کہ اس کا ذکر کتاب ملوک میں اس طرح کیا

گیا ہے کہ گویا ایک بہت معروف اور مشہور ملک کا نام ہے۔کتاب توریہ مثنی باب ا درس ۷، باب ۲ درس ۸ میں لفظ عربہ پایا جاتا ہے، مگر جو باتیں کہ ا س جزیرہ نما کی وجہ تسمیہ میں بیان کی گئی ہیں ان میں سے وہی ٹھیک معلوم ہوتی ہیں 'جو خود اس لفظ سے نکلتی ہیں اور جو اس ملک کی طبعی بناوٹ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔لفظ عربہ کے معنی وادی یا بیابان کے ہیں اور چوں کہ ایک بڑا حصہ جزیرہ عرب کا بالکل بیابان ہے اور وادی کے نام سے مشہور ہے، اسی وجہ سے کُل جزیرہ کا نام عرب ہو گیا۔"(۳)

سر سید نے عرب کی وجہ تسمیہ کو بیان کرنے کے بعد اس کے حدودِ اربعہ کے متعلق لکھا ہے۔ عرب کے حدودِ اربعہ میں اس کے مغرب میں بحرِ احمر، مشرق میں خلیج فارس و خلیج عمان، جنوب میں بحرِ ہند پایا جاتا ہے۔ شمال کی طرف اس کی سرحد بابل اور شام سے ملی ہوئی ہے اور اس کو آبنائے سویس مصر سے علیحدہ کرتی ہے۔ یہ جزیرہ نما شمال اور مغرب کی طرف کنعان سے ملا ہوا ہے۔ جو بنی اسرائیل کا وطن ہے، جس کو متقدمین یونانی فنشیا اور متوسط زمانے کے لوگ فلسطین یا ارضِ مقدس اور ابھی کے سریا یا شام کہتے ہیں۔ ملکِ عرب کی تقسیم کے متعلق سر سید احمد خان نے اپنی رائے دیتے ہوئے بطلیموس کے نقطہ نظر کو شامل کیا ہے اور ساتھ ہی عرب جغرافیہ دانوں کا ذکر کر کے ان کی تقسیم کو بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ عرب دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ایک عرب الحجر یعنی کوہستانی عرب جو خاکنائے سوئیس سے لے کر بحرِ احمر اور بحرِ عرب تک پھیلا ہوا ہے، دوسرا عرب الوادی یعنی عرب کا مشرقی حصہ مگر بطلیموس نے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ عرب الحجر یعنی پتھریلا عرب، عرب المعمور یعنی عرب آباداں، عرب الوادی یعنی ریگستانی عرب۔ آج کل کے نقشوں میں عرب الحجر میں صرف وہ حصہ ملک کا شامل رکھا گیا ہے جو خلیج سویس اور خلیج عقبہ کے درمیان واقع ہے مگر اس تقسیم کے لیے کوئی معتبر سند نہیں۔ بطلیموس کے جغرافیہ کے مطابق عرب الحجر کو خلیج سویس سے لے کر یمن یا عرب المعمور کی حد تک شمار کرنا چاہیے۔ وہ لوگ جن کے نزدیک بطلیموس نے عرب المعمور کو لفظ یمن کا ترجمہ کیا ہے، غلطی پر ہیں کیوں کہ اس پرانے جغرافیہ دان کے زمانے میں عرب الحجر کا جنوبی حصہ گنجان آباد تھا اور تجارت کے لیے مشہور تھا۔ جس کی وجہ سے اس نے تمام جزیرہ کے اس حصہ کا نام عرب المعمور رکھ دیا۔(۴)

سر سید نے جغرافیہ عرب کے مباحث کو مزید تفصیل سے بیان کرتے ہوئے عرب جغرافیہ دانوں کی تقسیم کو بھی شامل کیا ہے۔ عربی جغرافیہ دان جزیرہ عرب کو پانچ حصوں تہامہ، حجاز، نجد، عروض اور یمن میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس نکتے کو بیان کرتے ہوئے سر سید غیر عرب مؤرخ اور جغرافیہ دانوں کی اس غلط فہمی کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ اس ملک کو حجاز اس لیے کہتے ہیں کہ حاجی اور زائرین کا ایک عام مجمع یہاں ہر وقت موجود رہتا ہے لیکن یہ اس کی وجہ تسمیہ نہیں ہے۔ حجاز کے لفظی معنی اُس چیز کے ہیں، جو دو چیزوں کے درمیان بطور حجاب کے واقع ہے۔ عرب بلحاظ ان مختلف قوموں کے جو اس زمانے میں

وہاں آباد تھیں، ان آبادیوں کے ناموں کے اور ان آبادیوں کے ملکی حالات کے اور ان باشندوں کے اعتبار سے کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ ان کی درست تقسیم کا علم حاصل کرنا سر سید کے نزدیک مشکل ہے کیوں کہ عرب کی قدیم کتابوں میں اس کا ذکر نہیں ہے اور کتبِ مقدسہ کے لکھنے والوں نے بھی صرف "ارضِ موعود" کے حالات لکھے اور وہ اسی کی تحقیق و تلاش میں مصروف رہے اور غیر قوموں نے بھی اس ویران ملک کی تاریخ اور جغرافیہ سے کوئی دل چسپی نہ لی کہ وہ اس کے حالات کو رقم کرتے(۵)

سر سید نے عرب کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اس کے خصائص کو بیان کیا ہے کہ عرب وسیع سطح اور ایک ویران ملک ہے۔ جس کے کچھ حصے سر سبز ہیں اور اس میں بعض بلند ترین پہاڑ بھی موجود ہیں، جنھوں نے زمین کا ایک طویل حصہ اپنے اندر سمویا ہوا ہے۔ اس میں کثرت سے وادیاں بھی موجود ہیں مگر یہاں پانی کی شدید قلت ہے۔ عرب میں مختلف انواع و اقسام کے میوے ہوتے ہیں، جن میں کھجور سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اس کی پیداوار ملکِ عرب کے ساتھ مخصوص ہے اور یہاں کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کا ذریعہ معاش بھی یہی ہے۔ عرب کے گھوڑے عمدہ نسل کے ہیں لیکن یہاں کا سب سے مفید جانور اونٹ ہے، جس کو ریگستان کا جہاز لکھنا بے جا نہ ہو گا۔(۶)

سر سید احمد خان نے جغرافیہ عرب کو بیان کرتے ہوئے روایات و رسومِ عرب سے بھی بحث کی ہے اور اس کی تائید میں عرب کی ملکی روایتوں سے استدلال کیا ہے۔ وہ ان روایات کے مستند ہونے کو مستشرقین کی آرا سے بھی ثابت کرتے ہیں۔ سر سید لکھتے ہیں کہ عرب قوم اپنی آبائی رسوم اور عادات و اطوار کے بہت پابند تھے اور اس میں تبدیلی کرنا روا نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے نسب نامے یاد رکھے ہوئے تھے اور انھیں یاد رکھنا اپنا فرضِ اولین تصور کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ہر قبیلہ اپنی جداگانہ شناخت رکھتا تھا۔ ہر فرد اپنی قوم اور قبیلے سے بخوبی آگاہ تھا اور اپنے حسب نسب پر فخر کرتا تھا۔ عرب قوموں میں جب جنگیں ہوتی تھیں، تب لڑنے والے اپنا حسب نسب جتلاتے تھے، جو لڑائیوں میں جنگی باجوں کا کام دیتے تھے۔(۷) عرب کی ملکی روایتوں کے متعلق سر سید اپنے اس بیان کی تائید میں رورنڈ مسٹر فارسٹر کی رائے درج کرتے ہیں۔ "عربوں کی قدیمی اوضاع اور رسوم اور یادگاروں کی پابندی کو جو ہمیشہ سے زباں زدِ خاص و عام ہے۔ تمام دلائل میں سب سے اول رکھنا مناسب ہے کیوں کہ اس بات پر اتفاق ہے کہ ان کے قومی خاصوں میں سے یہ خاصہ سب سے مقدم ہے۔"(۸) فارسٹر نے یہاں عربوں کی زبانی روایت کی جانب اشارہ کیا ہے کہ عربوں کو زبانی اپنا حسب نسب یاد ہوتا تھا اور ان کا قوتِ حافظہ بہت مضبوط تھا۔ سر سید نے ڈین پریڈو کی عرب رسوم و رواج کے متعلق رائے کو بھی شامل کیا ہے:

> قوم عرب دنیا میں سب سے قدیم قوم ہے، جو اپنے مورثانِ اعلیٰ کے زمانہ سے آج تک نسلاً بعد نسل اپنے ملک میں رہتی چلی آئی ہے اور جس قدر کہ عرب اپنی رسوم و رواج میں تغیر و تبدل ناپسند کرتے ہیں، اسی قدر

> ملک کے ناموں کے بدلنے کو ناپسند کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اکثر مقاموں کے وہی نام بدستور چلے آتے ہیں جو ابتدا میں رکھے گئے تھے۔ اسی وجہ سے ملک مصر کے قدیمی دارالسلطنت کے رہنے والے مصری کہلاتے تھے اور بعد کو زمانہ دراز تک بنام ممفس مشہور رہے۔ عربوں کے تسلط کے زمانہ سے پھر مصری کہلانے لگے اور جب سے برابر یہ نام چلا آتا ہے۔(۹)

سرسید کے نزدیک عرب کی ملکی روایتیں عرب کے حالات جاننے کا مستند ذریعہ ہیں۔ ان کی رسوم کا علم مندرجہ ذیل امور سے معلوم ہو سکتا ہے۔ میدانِ جنگ میں کوئی جنگ آور اپنے حریف سے اس وقت تک لڑائی شروع نہیں کرتا تھا جب تک کہ وہ اپنا حسب نسب اس سے بیان نہ کر دے۔ اسی طرح عام مہم میں ہر شخص اپنے ہی قوم کے سردار کے جھنڈے کے نیچے قیام کرتا تھا۔ بعض اوقات جب کہ کسی قوم کے کسی آدمی سے کوئی جرم سرزد ہوتا تھا تو اس کی پاداش میں اس ساری قوم کو جرمانہ دینا پڑتا تھا، جس کو اب شرع میں "الدیت علی العائلہ" کہا جاتا ہے۔(۱۰)

جغرافیہ کے باب میں سرسید نے عربوں کی روایات سے استناد کرنے کا نکتہ پیش کرنے کے بعد ولیم میور کے اس اعتراض پر سیر حاصل بحث کی ہے کہ حضرت اسماعیلؑ و حضرت ہاجرہؑ کے مکہ میں سکونت کی کہانی بے بنیاد ہے اور فاران سے مراد مکہ نہیں ہے۔ سرسید اس اعتراض پر تین بڑے سوالات اٹھاتے ہیں اور ان کا جواب توریت سے دیتے ہیں۔ ان تینوں سوالوں کا تعلق حضرت اسماعیلؑ کی سکونت سے ہے، جب ان کو اپنی والدہ کے ہمراہ گھر سے جانے کا حکم ملا۔ سرسید کا پہلا سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو گھر سے نکال دینے کے بعد کہاں چھوڑا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہؑ نے بیابان میں کہاں سکونت اختیار کی؟ سرسید کا تیسرا سوال یہ ہے کہ گھر سے نکلنے کے بعد کیا وہ اسی جگہ متوطن ہوئیں جہاں پہلے پہل آ کے ٹھہری تھیں یا کسی اور جگہ انھوں نے قیام کیا۔(۱۱) سرسید یہ سوال اٹھانے کے بعد ان کے جوابات کے متعلق اپنی یہ رائے پیش کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں ان سوالوں کے جواب موجود نہیں ہیں اور اس ضمن میں جو احادیث بیان کی جاتی ہیں، ان کے راویوں کا سلسلہ حضورؐ تک نہیں پہنچتا اور جو مقامی روایات ہیں، وہ بھی خلط ملط ہو چکی ہیں، اس لیے ان پر بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وجوہات بیان کرنے کے بعد وہ توریت سے ان سوالوں اور ولیم میور کے اعتراض کا جواب دیتے ہیں۔ پہلے سوال سے متعلق ان کی یہ رائے ہے کہ جو کچھ توریت میں لکھا ہے، اس سے زیادہ بحث نہیں کرنی چاہیے۔ توریت میں لکھا ہے کہ "اس نے یعنی ابراہیمؑ نے اس کو یعنی ہاجرہؑ کو روانہ کر دیا اور وہ چلی گئی اور بیابان بیر شبع میں پھرتی رہی۔" (۱۲) (سفر تکوین باب ۲۱ درس ۱۴) بیر شبع قادیش میں موجود ہے، جو ملکِ عرب میں واقع ہے۔ باقی دونوں سوالوں کے جواب بھی سرسید نے توریت سے دیے ہیں۔ ان کے نقطہ نظر کو ذیل میں درج کیا گیا ہے۔

وہ یعنی اسمٰعیل بڑا ہوا اور بیابان میں سکونت پذیر ہوا اور ایک تیر انداز ہو گیا (سفر تکوین، باب ۲۱، درس ۲۰) اور دوسری جگہ لکھا ہے کہ اس نے یعنی (اسمٰعیل) نے بیابان فاران میں سکونت اختیار کی۔ (سفر تکوین، باب ۲۱، درس ۲۱) توریت کا کوئی مفسر نہیں بیان کرتا اور نہ ہی ملکی روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت اسمٰعیل پہلے کسی ملک میں آباد ہوئے ہوں اور پھر کسی اور ملک میں چلے گئے ہوں۔ اس لیے یہ بات تسلیم کرنی ضرور ہے کہ حضرت اسمٰعیل اور ان کی والدہ جس حصہ ملک میں آباد ہوئی تھیں، اسی میں آباد رہیں۔ پس توریت میں جہاں صرف بیابان میں آباد ہونے کا ذکر ہے۔ اس سے مراد بیابان فاران ہی ہے، جس کی تصریح دوسرے درس میں کی گئی ہے۔ پس ان سوالوں کا حل کرنا، اس بات کی تحقیق پر منحصر ہے کہ بیابان فاران جہاں کہ حضرت اسمٰعیل کا سکونت پذیر ہونا بیان کیا گیا ہے، کون سی جگہ ہے۔[۱۳]

سر سید نے مشرقی جغرافیہ دانوں کا بیان بھی فاران کے ضمن میں لکھا ہے، جن کے مطابق تین مقام فاران کے نام سے موسوم ہیں۔ اول وہ مقام اور اس کے گرد و نواح کے پہاڑ جہاں اب شہر مکہ واقع ہے کیوں کہ اس زمانہ میں وہ بیابان تھا۔ دوم وہ پہاڑ اور گاؤں جو مشرقی حصہ یا عرب الحجر میں واقع ہے۔ سوم ایک ضلع جو سمرقند کی نواح میں واقع ہے۔ [۱۴] مشرقی جغرافیہ دان فاران کو ملکِ عرب کا حصہ قرار دیتے ہیں جب کہ غیر مسلم مورخ فاران اور حجاز کو ایک ہی خطہ ارض نہیں کہتے کیوں کہ اگر وہ ایسا کہ دیں تو پھر وہ آمدِ محمد رسول اللہ سے انکار نہیں کر سکتے۔ سر سید اس باریک نکتے کو بخوبی جانتے تھے اسی وجہ سے انھوں نے توریت کا عمیق مطالعہ کیا اور وہاں سے بحثِ فاران کے لیے نکات پیش کیے تا کہ مستشرقین اپنی مذہبی کتابوں میں موجود دلائل کو رَد نہ کر سکیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> مجھے معلوم نہیں ہے کہ کسی غیر ملک اور مذہب کے مؤرخ نے فاران اور حجاز کو جہاں اب مکہ معظمہ واقع ہے، ایک ہی قرار دیا ہو لیکن عربی ترجمہ توریت سامری میں جس کو آر کوئی ٹن صاحب نے ۱۸۵۱ء میں بمقام لگڈنی بٹاورم چھپوایا ہے، اس میں فاران اور حجاز سے مراد ایک ہی جگہ لی ہے اور فاران کے لفظ کے آگے خطوط ہلالی (قوسین) میں حجاز لکھ دیا ہے اور وہ عبارت یہ ہے۔ "وسکن فی بحریۃ فران (الحجاز) واخذت لہ امہ امراۃ من ارضی مصر" (عربی ترجمہ توراۃ سامری)[۱۵]

فاران کے متعلق مختلف مصنفوں کے بیانات کے مطابق فاران سے وہ وسیع قطعہ زمین مراد ہے، جو بیر شبع کی شمالی حد سے لے کر کوہ سینا تک چلا گیا ہے اور فاران کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے حدود اربعہ یہ ہیں شمال میں کنعان، جنوب میں کوہ سینا، مغرب میں مصر اور مشرق میں کوہ سعیر، اس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے بیابان ہیں، جن کو ملا کر کُل

بیابان بنتا ہے اور وہ چھوٹے چھوٹے علاحدہ ناموں سے معروف ہیں، مثلاً شو، بیر شبع، اثیام، سین، زین، عیدام وغیرہ۔ سرسید نے اس حوالے سے لکھا ہے کہ اس بیان کی تردید سے بہتر ہے کہ توریت کی آیات نقل کی جائیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ فاران ایک جداگانہ بیابان ہے اور اس کے گرد و نواح کے بیابان اس میں شمار نہیں ہوتے۔ سرسید نے توریت سے جو حوالے دیے ہیں، وہ فارسی زبان میں ترجمہ شدہ توریت سے ہیں۔ اس مقالے میں ان آیات کا اردو ترجمہ عبید اللہ کوٹی کے مضمون"" سے لیا گیا ہے۔ ان آیات سے فاران کے متعلق توریت میں پیشن گوئیاں ظاہر ہوتی ہیں۔

الف)۔ تب بنی اسرائیل دشتِ سینا سے کوچ کر کے نکلے اور وہ ابر دشتِ فاران میں ٹھہر گیا (سفر اعداد باب ۱۰، درس ۱۲) اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے بیابان سینا سے کوچ کیا اور بیابان فاران میں مقام کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ تھے۔

ب)۔ اور چودھویں برس کدرلاعمر اور اس کے ساتھ کے بادشاہ آئے اور رفائیم کو عستارات فرنیم میں اور زوزیوں کو نام میں اور المیم کو سوی قریتیم میں اور حوریوں کو ان کے کوہ شعیر میں مارتے مارتے ایل فاران تک جو بیابان سے لگا ہوا ہے آئے۔ (پیدائش باب ۱۲، درس ۵ تا ۷) پس جب تک کہ بیابان فاران کو ایک علیحدہ مقام نہ تسلیم کیا جائے، اس درس کی عبارت مہمل ہو جاتی ہے۔[۱۶]

ان دونوں عبارات کو درج کرنے کے بعد سرسید نے مزید وضاحت کے لیے توریت سے درج ذیل اقتباسات کو شاملِ تحریر کیا ہے۔

ج)۔ اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو آدمیوں کو بھیج کہ وہ ملک کنعان کا جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں حال دریافت کریں، ان کے باپ دادا کے ہر قبیلہ سے ایک آدمی بھیجنا جو ان کے ہاں کا رئیس ہو، چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے ارشاد کے موافق دشت فاران سے ایسے آدمی روانہ کیے جو بنی اسرائیل کے سردار تھے۔ (سفر اعداد باب ۱۳، درس ۱ تا ۳)

د)۔ اور وہ چلے اور موسیٰ اور ہارون اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت کے پاس دشت فاران کے قادرس میں آئے اور ان کو اور ساری جماعت کو ساری کیفیت سنائی اور اس ملک کا پھل ان کا دکھایا۔ (سفر اعداد باب ۱۳، درس ۲۶)

ھ)۔ اور اس نے کہا، خداوند سیناسے آیا اور شعیر سے ان پر آشکار ہوا، کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا اور لاکھوں (فارسی ترجمہ میں: باہزار ہزاروں) قدسیوں میں سے آیا۔ اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لیے آتشی شریعت تھی۔ (استثنا باب ۳۳، درس ۲)

ر)۔ خدا تیمان سے آیا اور قدوس کوہ فاران سے، سلاہ اس کا جلال آسمان پر چھا گیا اور زمین اس کی حمد سے معمور ہو گئی۔(کتاب حوق باب ۳، درس ۳)

ز)۔ اور ڈمدیان سے نکل کر فاران میں آئے اور فاران سے لوگ ساتھ لے کر شاہ مصر فرعون کے پاس مصر میں گئے ۔(سلاطین اول باب ۱۱، درس ۱۸)[۱۷]

فاران کے کچھ محققین کا یہ گمان بھی ہے کہ قادیش جہاں حضرت ابراہیمؑ نے کنواں بیر شبع کھودا تھا، وہ اور فاران ایک ہی مقام کا نام ہے۔ سرسید نے اس رائے کی بھی تردید کر دی اور اس کے رد میں سفر اعداد باب ۱۳، درس ۲۶ سے توریت کی ایک عبارت نقل کی، جس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

> "اور حوریوں کو ان کے کوہ شعیر میں مارتے ایل فاران تک جو بیابان سے لگا ہوا ہے آئے پھر لوٹ کر عین مصفات یعنی قادرس پہنچے اور عمالیقوں کے تمام ملک کو اور اموریوں کو جو حصیصون تمر میں رہتے تھے مارا۔"[۱۸]

اس آیت کو مدِ نظر رکھا جائے تو جب تک قادیش اور فاران کو الگ الگ بیابان تصور نہیں کیا جائے گا، اس آیت کا کوئی مفہوم نہیں نکلے گا۔

جغرافیہ سیرت کے بیان میں سرسید نے دلائل اور اپنی ذاتی رائے سے مستشرقین کے دعویٰ کو غلط ثابت کرنے کے لیے توریت سے حوالے دیے ہیں۔ فاران پر بحث اس مقالے کے چوتھے باب سے تعلق رکھتی ہے مگر یہ جغرافیہ سیرت کا اہم حصہ ہے، اس لیے اسی باب میں اس مباحث کو بیان کیا جا رہا ہے۔ فاران کے متعلق مسٹر روپر نے لکھا ہے کہ فاران اس بیابان کا نام ہے، جو کوہِ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع ہے، سرسید کے نزدیک اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہاں ایک مقام فاران کے نام سے مشہور ہے مگر اصل سوال یہ ہے کہ آیا وہ وہی بیابان ہے، جس کا ذکر سفر تکوین پیدائش میں آیا ہے کہ حضرت اسماعیل صحرائے بیر شبع میں سرگردانی کے بعد وہاں آ کر رکے تھے اور وہ ان کا متوطن بنا تھا۔ اگر یہ ثابت نہ ہو سکے تو یہ وہ فاران نہیں جس کا ذکر کتابِ پیدائش میں آیا ہے۔ سرسید لکھتے ہیں:

> کوئی ملکی روایت ایسی موجود نہیں ہے جس سے ثابت ہو کہ حضرت اسمٰعیل نے اس جگہ سکونت اختیار کی تھی۔ رورنڈ فارسٹر جو اسی مقام کو حضرت اسمٰعیل کی سکونت کی جگہ خیال کرتے ہیں اور جس قدر دلائل اس کی تائید میں لاتے ہیں۔ وہ کسی قسم کی شہادت پر مبنی نہیں ہیں مگر ہم اس عرض سے

کہ ان کے غلط ہونے میں کچھ شبہ باقی نہ رہے، ان دلیلوں کی غلطی بیان کرتے ہیں۔[۱۹]

سر سید احمد خان نے اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے رورنڈ فارسٹر کی رائے درج کی ہے، جو اس نے سفر تکوین، پیدائش باب۲۵، درس۱۵ کی آیت: "اور اس کی اولاد حویلاہ سے شور تک مصر کے سامنے اس راستے پر ہے، جس سے اسور کو جاتے ہیں، آباد تھی" [۲۰] سے استدلال کر کے بیان کی ہے کہ خدا کا وعدہ پورا ہو گیا اور اسماعیلیوں کی آبادی شور سے حویلاہ تک انتہائے عرب میں یعنی سرحدِ مصر سے لے کر دریائے فرات تک پھیل گئی تھی۔ سر سید نے رورنڈ فارسٹر کی رائے پر اپنا نقطہ نظر تفصیل سے دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس رائے میں پہلی غلطی یہ ہے کہ فارسٹر نے حویلاہ کو دریائے فرات پر قرار دیا ہے، اصلی حویلاہ جس کے بانی کا نام سفر تکوین باب ۱۰ درس ۲۹ میں لکھا ہے کہ نواح یمن میں عرض بلد شمالی ۱۷ درجہ ۳۰ دقیقہ اور طول بلد شرقی ۴۲ درجہ ۳۶ دقیقہ پر واقع ہے اور اس کی کامل تصدیق عرب کے اس نقشہ کے معائنہ سے ہوتی ہے، جو عرب کے جغرافیہ کی شکل کے مطابق ہے۔ اس رائے کی دوسری غلطی کی نشان دہی کرتے ہوئے سر سید نے لکھا ہے کہ مصنف نے عیسائی مؤرخوں اور جغرافیہ دانوں کی طرح "شور" کو عرب الحجر کے مغرب میں قرار دیا ہے جہاں کہ صحرائے ایثام واقع ہے اور یہ درست نہیں کیوں کہ صحرائے "شور" سے توریت مقدس میں مراد تمام اس وسیع میدان سے ہے، جو شام سے لے کر جانب جنوب ملک مصر تک پھیلا ہوا ہے۔ اصل عبری توریت میں صرف دو نام ہیں۔ شور اور اشورہ۔ ان دونوں ناموں سے مراد (شور) شام اور (اشورہ) اسریا ہیں۔[۲۱] یہ ساری بحث لکھنے کے بعد سر سید اپنی حتمی رائے درج کرتے ہیں، جو ان کے قوتِ استدلال پر دلالت کرتا ہے۔

> اس سے صاف واضح ہے کہ بنی اسمٰعیل اس وسیع قطعہ میں آباد ہوئے تھے۔ جو شمالی حدود یمن سے جنوبی سرحد شام تک منتہٰی ہوتا ہے۔ یہ جگہ اب بنام حجاز معروف ہے اور فاران سے مطابقت رکھتی ہے۔ ہمارے اس نتیجہ کی اس امر سے تصدیق ہوتی ہے کہ یہی سرزمین ٹھیک مصر کے سامنے واقع ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص وہاں سے اسریا کی جانب عزیمت کرے اور توریت مقدس کی اس آیت کی کماحقہ تصدیق ہوتی ہے۔ جہاں لکھا ہے: جو کہ سامنے مصر کے ہے اگر تو اسریا کی روانہ ہو"۔ یعنی مصر کے سامنے ہے اگر تم ایک خط مستقیم وہاں سے اسریا تک کھینچو۔[۲۲]

فاران میں بنی اسمٰعیل کے قیام کو ثابت کرنے کے لیے حضرت ہاجرہؑ کا گھر سے نکلنے کے بعد یہاں آنے کا بیان ضروری ہے۔ اس نکتے پہ سر سید نے خاصی تحقیق کی ہے اور دلائل سے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ حضرت

ہاجرہؑ کو جب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت سارہؑ کے کہنے پر گھر سے نکال دیا تو اس صورت حال کو سفر تکوین باب ۲۱ درس ۱۵، ۱۴ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "ابراہیم نے صبح کو کچھ نان اور ایک مشکیزہ پانی کا ہاجرہ کو دیا اور ان دونوں کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ پھر بیابان کی طرف چلے دیے۔ جب رات آئی تو وہ (ہاجرہؑ و اسماعیلؑ) بیابان میں سرگرداں تھے اور وہ پانی جو مشکیزہ میں تھا، ختم ہو گیا۔ تب انھوں نے (ہاجرہؑ) اپنے بیٹے کو ایک جھاڑی کے نیچے لٹا دیا"[۲۳] توریت سے حوالہ دینے کے بعد سرسید نے اپنا نقطہ نظر یوں بیان کیا ہے کہ اس عبارت "جب رات آئی تو وہ (ہاجرہؑ و اسماعیلؑ) بیابان میں سرگرداں تھے اور وہ پانی جو مشکیزہ میں تھا، ختم ہو گیا" [۲۴] کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت ہاجرہؑ بیابان بیر شبع میں ہی سرگرداں رہیں اور ان کے پاس موجود پانی وہاں ختم ہو گیا کیوں کہ بیر شبع جو حضرت ابراہیمؑ نے قادیش کے پاس کھودا تھا اور جس کے اطراف میں وہ خود بھی طویل مدت تک قیام پذیر رہے تھے، ایک ایسا مقام تھا، جہاں اور بھی کنوئیں موجود تھے اور حضرت ہاجرہ اس بات سے ناواقف نہیں تھیں اور وہاں پانی بھی اس قدر نایاب نہیں تھا کہ اس کے لیے اتنی دوڑ دھوپ کی جاتی۔ سرسید کے نزدیک گھر سے نکال دیے جانے کے بعد حضرت ہاجرہؑ پہلے کو بیر شبع کے مقام پر موجود رہیں لیکن وہاں کے ماحول کی ناسازی اور ارد گرد مقیم اقوام کی جھگڑالو فطرت کی وجہ سے وہ ایسے مقام کی تلاش میں نکلیں، جہاں وہ امن سے رہ سکیں، اسی وجہ سے وہ عرب العاربہ اقوام کے مسکن کی طرف گئیں کیوں کہ وہاں امن کی صورت حال مناسب تھی۔ ان کے پاس موجود ایک چھاگل پانی ختم ہو گیا اور بیابان میں انھیں مزید پانی ملنے کی امید کم ہوتی نظر آرہی تھی۔ شدید پیاس سے حضرت اسماعیلؑ نڈھال ہو گئے۔ اس لیے انھیں ہاجرہؑ نے ایک جگہ پر لٹایا اور پانی تلاش کرنے لگی۔ سرسید کے بقول "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت ہاجرہؑ اس مقام پر پہنچیں جہاں اب مکہ معظمہ ہے تو ان کے پاس باقی پانی نہیں رہا تھا اور حضرت اسمٰعیلؑ تشنگی کے سبب سے ضعیف اور قریب مرگ ہو گئے ہوں گے اور حضرت ہاجرہؑ نہایت تشویش اور اضطراب کی حالت میں ادھر ادھر پانی کی تلاش میں دوڑتی پھرتی ہوں گی۔ یہ بیان ایسا صاف ہے، جس میں کوئی امر خلافِ قیاس یا خلافِ فطرت انسانی نہیں ہے۔"[۲۵]

عرب میں چوں کہ پانی کی قلت تھی، اس وجہ سے خانہ بدوش عربوں کو جہاں پانی کا چشمہ ملتا تھا، وہ اسے مٹی ڈال کر چھپا لیتے تھے تاکہ بوقتِ ضرورت اسے کام میں لا سکیں۔ حضرت ہاجرہؑ جب کیفیتِ اضطراب میں پانی کی تلاش میں سرگرداں تھیں تب انھیں وہ چشمہ ملا جس کا ذکر توریت (سفر تکوین باب ۲۱، درس ۱۹) میں پایا جاتا ہے:

> "خدا نے ان کی (ہاجرہؑ) آنکھیں کھول دیں اور انھوں نے ایک چشمہ آب دیکھا چناں چہ وہ فوراً روانہ ہوئیں اور اپنے مشکیزے کو پانی سے بھر لیا اور اپنے بیٹے کو پانی پلایا۔"[۲۶]

سر سید نے خطباتِ احمدیہ میں عربوں کی روایات سے استناد کرنے کا نکتہ پیش کیا ہے۔ اس موقع پر وہ عربوں کی روایت بیان کر کے اس پوری بحث کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عربی روایتوں میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے ایک فرشتہ اس مقام پر آیا، اس نے اپنے بازو سے ایک گڑھا کر دیا، جس سے پانی جاری ہو گیا۔ یہ ایک ایسی روایت ہے جس کو ایامِ جاہلیت کے عربوں نے ہمیشہ مستند تسلیم کیا ہے اور مختلف قوموں اور فرقوں میں بٹے ہونے کے باوجود اس امر میں سب کی اتفاقِ رائے ہے۔ اس لیے وہ اس روایت کو تسلیم کرتے ہیں اور توریت سے اس کے مصدق ہونے کی تصدیق بھی کرتے ہیں۔(۲۷)

سر سید احمد خان نے جغرافیہ کی بحث میں عربی روایتوں کو اس لیے بیان کیا ہے تا کہ وہ عرب میں سکونتِ حضرت ہاجرہؑ و حضرت اسماعیلؑ کو ثابت کر سکیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ عرب جو اپنی روایات میں نہایت پختہ تھے اور ان میں تبدیلی کو گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے حسب نسب پر نازاں تھے اور اسے زبانی نسل در نسل یاد رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی روایات میں اگر حضرت ہاجرہؑ و حضرت اسماعیلؑ کا باہر سے آ کر قیام کرنا موجود ہے تو اس کو مستند سمجھا جائے گا کیوں کہ عربوں کی زبانی روایتوں کے مستند ہونے کو خود مستشرقین نے قبول کیا ہے۔ سر سید نے یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ عرب قوم اپنی عادات و اطوار پر سختی سے عمل پیرا رہنے والی ہے۔ یہ تبدیلیوں کو جلد قبول نہیں کرتی، اسی وجہ سے باہر سے آ کر آباد ہونے والی قوموں کو یہ قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے اور ان سے بالکل علیحدہ رہتے ہیں۔ جب یہاں حضرت اسماعیلؑ آباد ہوئے تو انھیں عربوں نے "مستعربہ" کا نام دیا جو ان کے نزدیک تحقیر کو ظاہر کرتا ہے۔ سر سید نے عرب آبادی کی تقسیم کو بھی بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> تمام نئے آباد ہونے والے جو وقتاً فوقتاً عرب میں آباد ہوئے اور قدیم متوطنان عرب نے تین نام حاصل کیے تھے۔ اول عرب البائدہ یعنی صحرائی عرب، دوم عرب العاربہ یعنی قدیمی عرب، سوم عرب المستعربہ یعنی عرب میں نئے آباد ہونے والے۔ جو بہ سبب زمانہ دراز کی سکونت کے عرب بن گئے تھے۔ یہ تین تقسیمیں قریب قریب تمام باشندگانِ عرب پر حاوی ہیں ۔ خانہ بدوش بدوؤں سے لے کر ان قدرے شائستہ قوموں تک جو کنارہ کے برابر برابر آباد ہیں اور معہذا قدیم باشندگانِ عرب اور جدید باشندگانِ عرب کے درمیان تمیز قائم رکھتے ہیں۔(۲۸)

سر سید احمد خان نے خطباتِ احمدیہ کے دوسرے باب "اسلام سے پہلے عربوں کے رسم و رواج" میں عرب کی تہذیب و معاشرت کا مختصر احوال درج کیا ہے۔ جس سے ظہورِ اسلام سے قبل عرب کی سماجی صورت حال کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی

ہے۔ سر سید کا یہ انداز دراصل سیرت طیبہ کے ماحول کا پس منظری مطالعہ ہے۔ انھوں نے بعثتِ رسولؐ سے پہلے عرب کے حالات درج کیے ہیں تا کہ یہ بتایا جا سکے کہ اسلامی تعلیمات اور حضورؐ کے اخلاق و کردار کی بدولت عرب دنیا میں کس طرح انقلاب رونما ہوا اور اس نے پوری دنیا کو کیسے اپنی لپیٹ میں لے کر بلند اخلاقی معیارات قائم کیے۔

سر سید کے نزدیک عرب ابتدا سے سادہ مزاج قوم تھی، جس کی طرزِ معاشرت فطرت سے قریب تھی۔ وجودِ انسانی کا سلسلہ ابتدائی اور ادنیٰ درجہ کی حالت سے جب ترقی کر گیا تو گلہ بانی کے رتبہ پر پہنچا، جو اس کی پہلی حالت کی نسبت بہتر تھا۔ انسانوں نے آپس میں صلح و امن سے رہنے اور اپنی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کو یقینی بنایا۔ عرب میں بھیڑوں کی اون سے ایک خاص قسم کا موٹا ٹاٹ بنایا جانے لگا، جس کو میخوں سے زمین پر خیمہ کی طرح کھڑا کر کے وہ اس میں سکونت اختیار کرتے اور جب ان کا گلہ ایک جگہ سے دوسرے مقام کی طرف جانے لگتا تو وہ اسے اکھاڑ کر ساتھ لے جاتے۔ ان کی پوشاک ایک لمبی بُن سی ہوئی چادر ہوتی تھی، جس کو بطور تہمد کے اپنے کمر سے لپیٹ لیتے تھے۔ ان کا کھانا نیم برشت گوشت، اونٹ کا دودھ اور کھجوریں ہوتا تھا۔ ان کی ملکیت و جائیداد میں مویشی گھوڑے، اونٹ اور لونڈی و غلام ہوتے تھے اور تمام ملکیت میں لونڈی و غلام کو سب سے قیمتی خیال کیا جاتا تھا۔[۲۹] سر سید کا نقطہ نظر یہ ہے کہ عرب بدو کی طرزِ معاشرت کو خانہ بدوش عرب کا نمونہ خیال کیا جانا چاہیے کیوں کہ ان کی زندگی گزارنے کا انداز ایک چرواہے کے طرزِ زیست سے ملتا تھا۔ وہ خیموں میں رہتے اور چراگاہ کی جستجو میں ہوتے۔ ان میں جو زیادہ تمدن پسند تھے، وہ مل کے اپنے خیموں کی ترتیب سے باقاعدہ دیہات بنا لیتے تھے، جو بعد میں قصبوں اور شہروں کا روپ اختیار کر لیتے تھے۔ وہاں کے باشندے کاشت کاری میں کھجوروں اور درختوں کے بونے میں اپنا وقت صرف کرتے تھے۔ یہ تجارت کا پیشہ بھی اپناتے تھے اور سوداگری میں گرم مسالہ، بلسان، مر، لوبان، دار چینی، لیڈنن، سونا، جواہرات، موتی، ہاتھی دانت، آبنوس، لونڈی و غلام کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ سر سید خانہ بدوش اور تجارت پیشہ عرب کی طرزِ معاشرت کے متعلق لکھتے ہیں:

> بہت پرانے زمانہ سے یہ لوگ مصر اور شام اور قرب و جوار کے ملکوں سے بذریعہ کارواں کے تجارت کرتے تھے۔ توریت سے بھی پایا جاتا ہے کہ یہ لوگ حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے وقت میں بھی یہی پیشہ رکھتے تھے مگر ان دونو قوموں یعنی خانہ بدوش اور تجارت پیشہ کا قومی چال چلن ایک ہی سا تھا۔ کھانے پینے میں کم خرچ اور کفایت شعار ہونا اور اس پر راضی اور قانع رہنا ایک عمدہ اور بیش بہا وصف خیال کیا جاتا تھا۔[۳۰]

سر سید احمد خان نے عربوں کے اوصاف بھی بیان کیے ہیں کہ فیاضت اور مہمان نوازی ان کا قومی خاصہ تھا۔ وہ مسافروں اور مہمانوں کی خاطر داری نہایت فیاضی سے کرتے تھے اور اس میں غفلت کرنے والے کو سب دل سے ناپسند کرتے تھے۔ ہمسایہ کے حالات سے باخبر رہنا اور اس کے گھر و مال و اعیال کی حفاظت کرنا ضروری خیال کرتے تھے۔ قیدیوں کو چھڑانا، محتاج و بے کس کی امداد کرنا اور وعدہ ایفا کرنا شریف عرب کے خصائص میں شامل تھا۔ عرب صاف ستھری پوشاک اور عمدہ خوشبو کو پسند کرتے تھے اور گھڑ سواری کو اپنی شان کے اظہار کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ اگر کوئی بڑا ہو کر گھوڑے کی سواری سیکھتا تو اس کو طنز کا نشانہ بناتے کیوں کہ وہ بچپن میں اس کی سواری سیکھنے کو قابلِ تعریف تصور کرتے تھے۔ بھیڑیا کا شکار کرنا بہادری کی علامت تھا اور وہ ریگستان کے طول و عرض کا اندازہ اس کی ریت کی ایک مٹھی بھر سونگھنے سے دریافت کرتے تھے۔ زمانہ جاہلیت کے عربوں میں شعر و شاعری نہایت اعلیٰ درجہ پر پہنچ چکی تھی۔ (۳۱)

خطباتِ احمدیہ میں سر سید نے عربوں کے امتیازی اوصاف بیان کرنے کے بعد زمانہ جاہلیت میں ان کی بد اخلاقی و فحش مزاجی کو موضوع بنایا ہے۔ عربوں کی شاعری جہاں فصاحتِ زباں و بیاں کی بنیاد پر عروج کو پہنچ چکی تھی وہیں اس میں فحش گوئی کا عنصر بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ عربی قصائد کے تشبیب میں دولت مند گھرانوں کی عورتوں کے نام لے کر ہر طرح کے عیوب ان کے ساتھ منسوب کر دیے جاتے تھے۔ عربوں کا یہ عقیدہ تھا کہ ہر بڑے شاعر کے اختیار میں ایک جِن ہوتا ہے اور جس قدر بڑا شاعر ہوتا ہے، اسی قدر زبردست جِن اس کے تصرف میں ہوتا ہے۔ عربوں میں بدکاری و زناکاری عام تھا۔ قمار بازی اور شراب خوری ان کی گھٹی میں شامل تھا۔ لونڈیوں کو وہ قینات کہتے تھے۔ انھیں گانا بجانا اور ناچنا سکھایا جاتا تھا۔ وہ حرام کاری کرنے کی مجاز تھیں اور اس سے جو آمدنی جمع ہوتی تھی، وہ ان کے آقا اپنے استعمال میں لاتے تھے۔ (۳۲)

عرب معاشرت میں رہزنی اور قتل و غارت گری عام تھی۔ انسانی خون کی عربوں کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ لڑائی میں جو عورتیں قید ہوتی تھیں۔ ان کو فتح مند لونڈیاں بنالیا جاتا تھا۔ عرب معاشرے میں عورت کی سماجی قدر و قیمت نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے اور مردوں کو اختیار تھا کہ وہ ایک وقت میں کئی عورتوں سے شادی کر لیں۔ سر سید نے عربوں کے متعلق لکھا ہے کہ ان کے یہاں اس بات کا تعین کرنے کے لیے کہ مرد کو کون سی قرابت مند عورت سے شادی کرنا جائز ہے اور کون سی سے ناجائز؟ کوئی باضابطہ قانون موجود نہیں تھا البتہ ان کے یہاں یہ بات عام تھی کہ وہ "اس عورت سے جو قریب تر رشتہ رکھتی ہو، ازدواج نہیں کرتے تھے اور یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ ایسی عورت کی اولاد عموماً ضعیف اور کمزور ہوتی ہے۔" (۳۳)

سر سید نے یہاں عربوں میں رائج سلسلہ طلاق کو بھی موضوع بنایا ہے کیوں کہ کثرتِ ازدواج اور مسئلہ طلاق پر مستشرقین نے اعتراضات اٹھائے۔ سر سید نے خطباتِ احمدیہ کے دوسرے باب میں عربوں کی معاشرت کا احوال اسی لیے درج کیا ہے تا کہ وہ اگلے ابواب میں ان سوالوں کے جواب تحریر کر سکیں، جن کا تعلق مستشرقین سے ہے۔ طلاق کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ عرب مہر باندھ کر شادی کرتے تھے اور طلاق بھی دے دیتے تھے مگر ان کی طلاق کی کوئی تعداد مقرر نہیں تھی۔ ایک مرد اپنی بیوی کو ہزار مرتبہ طلاق دے کر اسے دوبارہ اپنی زوجیت میں لے لیتا تھا۔ ان میں ایک رواج یہ تھا کہ طلاق کے بعد ایک مسیعاد مقرر تھی، جس کے اندر عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ اس میعاد میں اگر مرد و عورت میں صلح ہو جاتی تو مرد اسے دوبارہ اپنی زوجیت میں لے لیتا۔ عرب مردوں نے یہ وتیرہ بنالیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو تعلق دیتے اور مقررہ مدت پوری ہونے سے پہلے اسے دوبارہ اپنی زوجیت میں لے لیتے، کچھ عرصے بعد پھر اسے طلاق دے دیتے اور پھر زوجیت میں لے لیتے، یوں یہ ظالمانہ سلسلہ جاری رہتا اور وہ عورت کسی اور سے شادی نہ کر پاتی کیوں کہ عربوں میں اسے اپنی تذلیل سمجھا جاتا تھا کہ ان کی چھوڑی ہوئی عورت سے کوئی دوسرا مرد شادی کر لے۔[۳۴] سر سید نے زمانہ جاہلیت میں عربوں میں جاری طلاق کی ایک اور صورت "ظہار" کا حوالہ بھی دیا ہے۔ طلاق کی ایک شکل میں مرد اپنی زوجہ کے ایک عضو کو چھونے سے باز رہتا تھا کہ "مجھ کو اپنی زوجہ کے جسم کے فلاں عضو کو چھونا ایسا حرام ہے جیسا کہ اپنی ماں یا کسی اور قریب رشتہ والی عورت کے، جس کے ساتھ ازدواج ناجائز ہے عضو کا چھونا۔ اس کہنے سے طلاق ہو جاتی تھی۔"[۳۵]

عربوں میں یہ رواج بھی تھا کہ مرد اپنی سوتیلی ماں سے شادی کر لیتے تھے مگر باپ اپنے بیٹے یا متبنّٰی کی زوجہ کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا تھا۔ عربوں میں رسمِ تبنیت عام تھی اور متبنّٰی پسر اپنے والدین کی جائداد کا وارث خیال ہوتا تھا۔ بیوہ عورتیں کامل سال اپنے متوفی شوہر کا سوگ بناتی تھی اور میعادِ معینہ کے بعد "بیوہ عورت اونٹ کی چند خشک مینگنیں یا تو کسی کتے پر یا کندھے پر سے خود اپنے ہی پیٹھ پر پھینک دیتی تھی۔ جس سے یہ مراد تھی کہ اب بیوہ کو اپنے متوفی شوہر کا کچھ بھی خیال نہیں رہا۔"[۳۶]

عورتیں اپنے گھر سے بغیر پردے کے باہر نکلتی تھی اور مجمعوں میں جاتی تھیں۔ اپنے جسم کے کسی حصہ کو کھلا رکھنے اور عوام الناس کو دکھانے میں بے حیائی یا بے شرمی محسوس نہیں کی جاتی تھی۔ عورتوں کے خاص ایام میں انھیں خاندان کے باقی اشخاص سے ملنے پر پابندی تھی۔[۳۷]

زمانہ جاہلیت میں عرب ٹوٹکوں اور شگونوں سے مدد لیتے تھے اور اپنے کسی کام کے ہو جانے پر بھیڑ کی قربانی کی منت مانتے تھے اور جب وہ کام ہو جاتا تو بھیڑ کے بجائے ہرن کو مار دیتے تھے اور اس کو عتیرہ کہتے تھے۔ خون کا بدلہ خون ہی گردانا جاتا تھا اور جو کوئی اس کے بدلے دیت لیتا تھا اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ "اگر کسی آدمی

کے خون کا عوض خون نہ لیا جاوے تو ایک چھوٹا پر دار کیڑا مقتول کے سر میں سے نکل کر آسمان میں چیختا پھرتا ہے۔ اس عجیب کیڑے کو "ہامہ" اور "صدی" کہتے تھے"۔[۳۸] ہر شخص کے مرنے کے بعد یہ دستور تھا کہ اس کے اونٹ کو اس کی قبر سے باندھ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ بھوک و پیاس سے مر جاتا تھا۔ اس اونٹ کو "بلیہ" کہا جاتا تھا[۳۹] اور مرنے والے کا ایک سال تک سوگ منایا جاتا تھا۔

عرب معاشرے میں سود خوری عام تھی۔ وہ سود پر قرض لیتے اور دیتے تھے۔ اس کا قاعدہ ان کے یہاں یہ تھا کہ اگر قرضہ معینہ مدت میں ادا نہ ہوا تو اس کی تعداد دوگُنا بڑھا دی جاتی تھی اور میعادِ ادا میں بھی توسیع کر دی جاتی تھی۔ عربوں کے قبیلوں میں چھوٹی سی غلط فہمی پر باہم جنگ و جدل شروع ہو جاتی تھی اور بعض اوقات یہ لڑائیاں برسوں جاری رہتی تھیں۔ جن کی مثال سر سید نے عیص اور ذبیان کی سو برس تک چلتی لڑائی سے دی ہے۔[۴۰]

سر سید احمد خان نے عربوں کے عقیدے کو بھی موضوع بنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ عربوں میں بُت پرستی عام تھی ۔ وہ بتوں کو پوجتے تھے اور ہر قبیلے کا اپنا الگ بُت بھی تھا۔ ہبل بہت بڑا بُت تھا، جو خانہ کعبہ کے اوپر رکھا ہوا تھا اس کے علاوہ کعبہ کے اندر حضرت ابراہیمؑ کی ایک مورت بنی ہوئی تھی، جس کے ہاتھ پر یہ استخارہ کرتے تھے۔ کعبہ کی دیواروں پر حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ کی تصویریں آویزاں کی گئی تھیں۔ حضرت مریمؑ کی مورت اور ایک تصویر جس میں حضرت عیسیٰؑ ان کی گود میں دکھائے گئے تھے، دیوار پر لٹکائی گئی تھی۔ عربوں کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ "وُد، یغوث، یعوق اور نسر" نام کے چار مشہور لوگ ایامِ جاہلیت میں گزرے تھے، ان کی تصویریں بھی پتھروں پر منّقش کر کے بطور یادگار کعبہ کے اندر رکھی گئی تھیں، بعد میں مکہ والے انھیں بھی پوجنا شروع ہو گئے۔ سر سید عربوں کے عقیدہ کے متعلق لکھتے ہیں:

> عربوں کا اعتقاد یہ بھی تھا کہ خدا تعالیٰ کی جملہ قدرتیں بیماروں کو شفا بخشنا۔ بیٹا بیٹی عطا کرنا، قحط و وبا اور دیگر آفات ارضی و سماوی کا دور کرنا، ان کے مشہور و معروف لوگوں کے اختیار میں بھی تھا۔ جن کی طرف انہوں نے صفات الوّہیت منسوب کی تھیں اور وہ یہ خیال کرتے تھے کہ اگر مورتوں کی تعظیم اور پرستش کی جاوے گی تو ان کی دعائیں اور منتیں قبول ہوں گی۔ ان کا یہ بھی مستحکم عقیدہ تھا کہ یہ اشخاص خدا تعالیٰ کے محبوب تھے اور اپنی مورتوں کی پرستش سے خوش ہو کر پرستش کرنے والوں کو خدا تعالیٰ کے قرب حاصل کرانے کا ذریعہ ہوں گے اور ان کو تمام روحانی خوشی عطا کریں گے اور ان کی مغفرت کی شفاعت کریں گے۔[۴۱]

عرب کی پرستش کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ بتوں کو سجدہ کرتے تھے اور ان کے گرد طواف کر کے انھیں تعظیم سے بوسہ دیتے تھے۔ وہ ان بتوں کے نام پر جانور قربان کرتے تھے اور بتوں کے ساتھ ساتھ دیویوں اور خبیث ارواح کو بھی مانتے تھے۔ وہ نیک و بد جنات پر عقیدہ رکھتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ بعض جنات کا نصف بدن انسان کا سا اور نصف روحانی ہوتا ہے۔ یہ انسان کو دکھائی نہیں دیتے مگر مستقبل کی خبریں با آواز بلند ظاہر کرتے ہیں۔ یہ فرشتوں کا اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور اجرامِ فلکی کے انسان کی قسمت پر اثرات کو تسلیم کرتے تھے۔ (۴۲)

سر سید احمد خان نے تفصیلاً عربوں کے عقائد کو بیان کیا ہے۔ وہ ان کے حج کے طریق کار کی بھی وضاحت کرتے ہیں کہ اہلِ عرب احرام باندھ کر حج کرتے تھے مگر وہ اسے پہن کر گھر کے سامنے والے دروازے سے داخل نہیں ہو سکتے تھے بلکہ انھیں پچھواڑے کی دیوار پھلانگ کر اندر آنا پڑتا تھا۔ حج میں وہ صفا و مروہ کی سعی بھی کرتے تھے۔ ان کی عبادت کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ خانہ کعبہ کے اندر بیٹھ کر خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے اور اس کے گرد طواف بھی کرتے تھے لیکن اس دوران وہ مکمل برہنہ ہوتے تھے کیوں کہ عرب اس بات کو غلط سمجھتے تھے کہ خدا تعالیٰ کی عبادت کپڑے پہن کر کریں جو ہر قسم کے گناہوں میں ملوّث ہوتے ہیں۔ (۴۳)

غرض سر سید احمد خان نے اختصار سے کام لیتے ہوئے زمانہ جاہلیت کے عرب کی طرزِ معاشرت، رسوم و رواج اور ان کے عقائد کو بیان کیا ہے۔ اس سے ان کا مقصود آنحضرتؐ کی بعثت سے قبل عرب کے اخلاقی و معاشرتی معیارات کو پیش کرنا ہے تاکہ قارئین محمد رسول اللہؐ کی تعلیمات کی اثر پذیری کا اندازہ لگا سکیں کہ کس طرح محض تیئس برس میں آپؐ نے پورے مکہ کے سیاسی، سماجی، اخلاقی، معاشرتی حالات کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔

۲۔ رحمۃ للعالمین:

سر سید احمد خان نے پہلی مرتبہ اردو زبان میں عرب کے جغرافیہ کو سیرتِ محمدؐ کے تناظر میں اہمیت دیتے ہوئے اس پر ایک مکمل باب تحقیق و تدقیق سے رقم کیا جو بعد کے سیرت نگاروں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوا اور انھوں نے سیرت لکھتے ہوئے عرب کے جغرافیہ اور تہذیب و معاشرت کو بیان کرنا ضروری سمجھا۔ گو سر سید کے برعکس انھوں نے جغرافیائی معلومات کو مختصراً بیان کیا مگر اس کو شاملِ تصنیف کرنا ضروری خیال کیا۔ انھی سیرت نگاروں میں قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری نے رحمۃ للعالمین کے عنوان سے نبی پاک ﷺ کی سیرت تین جلدوں پر مشتمل لکھی ہے۔ جس میں سیرت کے مختلف گوشوں کو تحقیقی و منطقی استدلال سے زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ انھوں نے عرب کے محل وقوع اور اس کی سیاسی و اخلاقی حالت پر بھی روشنی ڈالی ہے تاکہ ان کو مدِ نظر رکھ کر سیرتِ محمدیؐ کا مطالعہ کیا جا سکے کہ کس طرح محمد رسول اللہؐ کی تعلیمات سے عرب معاشرے میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

قاضی صاحب نے عرب کا محل وقوع لکھا ہے کہ عرب وہ جزیرہ نما ہے۔ جس کے مغرب میں بحر احمر اور جنوب میں بحر ہند، مشرق میں خلیج فارس اور شمال میں ملک شام ہے۔ اسے شام سے وہ سلسلہ کوہ جدا کرتا ہے جو اس کے شمال میں چلا گیا ہے اور مصر سے آبنائے سویز الگ کرتی ہے۔ ہندوستان اور عرب میں خلیج بحیرہ عرب ہے۔ عرب وسعت میں مملکتِ فرانس سے تقریباً دو چند بڑا ہے۔ یمن کی وادی اور طائف کے پہاڑ سرسبز ہیں اور الحجر کی پتھریلی زمین اور وسط عرب کا وسیع ریگستان بے آب و گیاہ ہے۔[۴۴] عرب کے جغرافیہ کو بیان کرتے ہوئے قاضی منصور پوری نے ایک اہم نکتہ اٹھایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ خدا نے اسے ایشیا، یورپ اور افریقہ کے براعظموں کے وسط میں جگہ دی ہے اور وہ خشکی و تری دونوں اطراف سے دنیا کو اپنے دائیں اور بائیں ہاتھ سے ملا کر ایک کر رہا ہے۔ اس لیے ایسے ملک میں دنیا کے جملہ مذاہب کا پہنچ جانا اور جہالت کی حکومت اعلیٰ کے زیرِ اثر ہو کر سب کا بگڑ جانا، ان پہلو کو پیش کرتا ہے کہ اگر تمام دنیا کی ہدایت کے واسطے ایک واحد مرکز قائم کرنے کے لیے قدرت کسی جگہ کا انتخاب کرے تو وہ عرب کا خطہ ارض ہی ہو گا۔ خصوصاً جس زمانہ میں یہاں بعثتِ محمدؐ ہوئی، تب افریقہ، یورپ اور ایشیا کی تین بڑی سلطنتوں کا تعلق عرب سے تھا اور یہاں کی آواز ان براعظموں میں جلد پہنچ سکنے کی توقع تھی کیوں کہ عرب تمام دنیا کے مرکز میں موجود ہے اور یہی اس کی جغرافیائی اہمیت کو پیش کرتا ہے۔ منصور پوری کی اس ضمن میں یہ رائے ہے کہ "رب العالمین نے (جہاں تک میں سمجھتا ہوں) اسی لیے سیدنا محمد رسول ﷺ کو عرب میں پیدا کیا اور ان کو بتدریج قوم اور ملک اور عالم کی ہدایت کا کام سپرد کیا"۔[۴۵] قاضی صاحب نے گو جغرافیہ عرب نہایت مختصراً بیان کیا ہے مگر انھوں نے اسی اختصار میں عرب کی جغرافیائی اہمیت کا نقشہ واضح کر کے عرب میں بعثتِ محمدؐ کی تصریح کر دی ہے کہ آپؐ کا وہاں مبعوث ہونا در حقیقت عالم کی اصلاح کا سبب تھا اور وہاں سے اللہ تعالیٰ کا پیغام تمام دنیا تک باآسانی پہنچایا جا سکتا تھا کیوں کہ آپؐ آخری نبی تھے اور آپؐ کے بعد نبوت کا سلسلہ اختتام پذیر ہونا تھا۔ اسی لیے عرب جو دنیا کے مرکز میں موجود ہے، وہاں آخری نبی کو مبعوث کر کے انسانیت پر اتمامِ حجت کر دی گئی۔

قاضی منصور پوری نے عرب کی سیاسی، اخلاقی اور مذہبی حالت کو بھی موضوع بنایا ہے مگر ان کو بیان کرتے ہوئے انھوں نے حد درجہ اختصار سے کام لیا ہے۔ عرب کی سیاسی حالت لکھتے ہوئے انھوں نے صرف یہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ "ہم جس ستودہ صفات کے عہد سے اپنی کتاب کا آغاز کرنے والے ہیں، ان کی پیدائش کے وقت عرب کی ملکی اور اخلاقی حالت کا یہ حال تھا کہ ان کے جنوب پر سلطنت حبش کا اور مشرقی حصہ پر سلطنت فارس کا اور شمالی اقطاع پر روما کی مشرقی شاخ سلطنت قسطنطنیہ کا قبضہ تھا۔ اندرونِ ملک بزعم خود آزاد تھا لیکن ہر ایک سلطنت اس پر قبضہ کرنے کے لیے ساعی کر رہی تھی"۔[۴۶] قاضی منصور پوری نے اس اقتباس میں اشارہ کیا ہے کہ وہ عرب کی تاریخ کو وہاں سے لکھیں گے، جہاں سے آمدِ محمد رسول اللہ ﷺ کا دور شروع ہوتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے دوسرے سیرت نگاروں کی طرح عرب کی قدیم حکومتوں اور ان کے عروج و زوال کی داستان کو رقم نہیں کیا مگر انھوں نے اپنی اس کتاب میں حضورؐ کی ولادت کے وقت

عرب کی سیاسی حالت کا تفصیلی نقشہ بھی نہیں کھینچا کہ وہاں کس ملک میں کس خاندان کی حکومت تھی اور عرب کے دیگر اقوام سے کیسے تعلقات تھے؟

سیرتِ محمدؐ کے بیان میں عرب کی اخلاقی حالت ایک ایسا اہم پہلو ہے، جسے ہر سیرت نگار بیان کرنا ضروری تصور کرتا ہے کیوں کہ عربوں کی قبل از اسلام اخلاقی زبوں حالی کے پس منظر میں اسلامی تعلیمات کی افادیت کو بیان کیا جاتا ہے۔ قاضی سلیمان نے عرب کی اخلاقی حالت کے عنوان سے اس نکتے کو بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ عرب چوں کہ اندرونی طور پر آزاد تھا، اسی وجہ سے یہاں کے باشندوں کی خود مختاری نے ان کے اخلاقی حالات پر برا اثر ڈالا اور ان میں بہت سی اخلاقی برائیوں نے جنم لیا۔ ان میں نسلی تعصب اور خود سری پیدا ہو گئی، جس کی وجہ سے وہ اپنی بہادری و شجاعت کا اظہار خود اپنے بھائیوں پر کرنے لگے اور قبائلی لڑائیوں نے خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی جس میں اگر دو قبیلوں کے درمیان معمولی سی بات پر اختلاف ہوتا تو وہ قبائلی جنگ کا روپ دھار کے کئی سالوں بلکہ کئی نسلوں تک جاری رہتا۔ شراب نوشی اور جوا کھیلنا ان کی فطرتِ ثانی تھا۔ چوں کہ وہ دوسری اقوام سے الگ تھلگ رہتے تھے، اس وجہ سے ان کی زبان اور نسل میں ملاوٹ نہیں تھی لیکن قاضی منصور پوری کے نزدیک وہ اپنی زبان کی فصاحت کا استعمال دوسری قوموں کی تحقیر کرنے میں کیا کرتے تھے یا اپنی معشوقہ کے ساتھ فحش کارناموں کی تشہیر میں اپنی تمام تر زبان دانی کا اثر دکھاتے تھے۔ دوسری اقوام سے تعلقات نہ ہونے کی وجہ سے یہ آپس میں ہی رشتہ داری کرتے تھے اور مدعیانِ شرافت بہت فخر سے اپنی بیٹیوں کو زندہ در گور کر دیتے تھے اور اس میں کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرتے تھے۔(۴۷)

عربوں کی اخلاقی حالت کی قاضی منصور پوری نے مزید وضاحت کرتے ہوئے ان میں رائج بت پرستی کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے مطابق بت پرستی نے عربوں کے دل و دماغ پر قابض ہو کر ان کو توہم پرست بنا دیا تھا، اسی وجہ سے وہ فطرت کی ہر ایک چیز پتھر، چاند، سورج کو اپنا معبود سمجھنے لگے تھے اور اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کو فراموش کر کے خود اپنی عزتِ نفس کو بھی پامال کر چکے تھے۔ ان کے نزدیک انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھے۔ وہ بتوں کے نذرانے کے طور پر انسانی جان کو قربان کر دیتے تھے۔ قتلِ انسان، رہزنی، لوٹ مار، عورتوں پر جبر، بیٹیوں کو جان سے مار دینا ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا کیوں کہ بت پرستی نے ان کی نگاہوں میں انسانی جان کو بالکل ارزاں کر دیا تھا۔ مصنف کے مطابق "برسوں بلکہ نسلوں اور صدیوں کے جمود نے ان کے دل و دماغ میں یہی نقش کر دیا تھا کہ ان کی حالت سے بہتر کوئی حالت، ان کے تمدن سے بہتر کوئی تمدن اور ان کے تدین سے بہتر کوئی تدین ہو ہی نہیں سکتا۔"۴۸ قاضی سلیمان نے عرب کی اخلاقی حالت کے ساتھ اس کی مذہبی حالت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ عرب کے مختلف اطراف میں متنوع حکومتوں اور سلطنتوں کی موجودگی کی وجہ سے یہاں تمام ملک میں کئی مذاہب موجود تھے۔ یہودی، عیسائی اور صابی مذہب کے پیروکار بھی بت پرستوں کے ساتھ یہاں موجود تھے۔ قاضی سلیمان لکھتے ہیں:

> یہودی، عیسائی، صابی ایسے مذاہب ہیں جن کے نام سن کر ناواقف شخص دھوکہ کھا سکتا ہے کہ ان لوگوں میں ان مذاہب کی عمدگیوں کے نمونے بھی پائے جاتے ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے آپ کو مذہب سے درست کرنے کی بجائے مذہب کو اپنی وجہ سے خراب کر دیا تھا۔ اگر موسیٰؑ و عیسیٰؑ و شعیبؑ و صالحؑ پیغمبروں کو ان کو دیکھنے کا موقع ملتا تو ہرگز نہ پہچان سکتے کہ یہ ہمارے اصول پر چلنے والے لوگ ہیں۔(۴۹)

عرب میں موجود تمام مذاہب کے پیروکاروں نے ان کے بنیادی عقائد میں تبدیلیاں کر دیں تھیں۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرنے کے بجائے اس کے شریک بنا دیے تھے اور وہ شریک بھی بیوی، بیٹے اور بیٹیوں کے روپ میں تھے۔ عام عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو "ابن اللہ" کہتے ہیں لیکن عرب کے عیسائی مریمؑ کو خدا کی "جورو" اور فرشتوں کو خدا کی "بیٹیاں" کہا کرتے تھے اور بت پرست تو لات و عزیٰ کو مؤنث خدا بھی کہتے تھے۔ اس سارے تغیر و تبدل میں یہودی قوم بھی پیچھے نہ رہی ۔ اس زمانہ کے عام یہودیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عزیرؑ نے چوں کہ زبانی توریت لکھی ہے، اس وجہ سے وہ انھیں "ابن اللہ" کہا کرتے تھے مگر عرب یہودیوں کا عقیدہ دوسروں سے مختلف تھا، وہ اپنی قوم کے سب زن و مرد کو خدا کے بیٹے، بیٹی، پیارے، پیاری کہا کرتے تھے۔ آتش پرستوں کی اخلاقی و مذہبی گراوٹ کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی بہن، بیٹی سے رشتہ ازدواج قائم کر لیتے تھے اور عرب کے بت پرست اپنی حقیقی والدہ کو چھوڑ کر اپنے باپ کی دوسری بیویوں کو اپنی لونڈیاں بنالیا کرتے تھے۔ عرب کے مجموعی حالات کے متعلق قاضی منصور پوری نے لکھا ہے کہ:

> عرب کی جملہ اقوام (باستثنائے بعض افراد) لکھنے پڑھنے سے بے خبر، علوم سے بے بہرہ، فنون سے عاری، تمدن سے ناواقف، مصالحت اور معافی سے ناآشنا تھے۔ ملحد اور دہریے بھی عرب میں آباد تھے، وہ حیات اور موت کو اتفاق اور وقت سے موسوم کر کے دنیا کے ہر انقلاب کو دور زمانہ سے منسوب کیا کرتے تھے۔ خدا کی ہستی کا اقرار اور جزا و سزا کا تصور، نیک و بد افعال پر نیک و بد نتائج مرتب ہونا ان کے نزدیک قابلِ تمسخر خیال تھا، ان جملہ عیوب کی وجہ سے عرب گویا جملہ مذاہب باطلہ اور تخیلات کی برائیوں کا مجموعہ تھا۔(۵۰)

قاضی سلیمان نے رحمۃ للعالمین میں عرب کے ساتھ دنیا کے حالات کا بھی مختصر نقشہ کھینچا ہے تاکہ اس سارے ماحول کو ذہن میں رکھ کر سیرتِ محمدؐ کی تعلیمات سے برپا ہونے والے انقلاب کا تجزیہ کیا جا سکے۔ جس زمانے میں

آپؐ مبعوث ہوئے، اس وقت تمام عالم پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور پوری دنیا پر وحشت و دہشت طاری تھی اور انسانیت کے مفہوم سے دنیا نابلد تھی۔ بنی اسرائیل میں اپنی ہمسایہ اقوام کے اثر سے بُت پرستی قائم ہو چکی تھی اور یورپ میں بھی جہالت اپنے عروج پر تھی۔ انگلستان میں برٹن اور سیکسن وحشی قومیں آباد تھیں۔ نارتھمبر لینڈ، مڈ لینڈ، کون ٹیز، نارفوک، ساسیکس میں "ورڈن بت" کی پرستش کی جاتی تھی۔ فرانس سیکسن قوم سے دریائے الب پر محاذِ جنگ میں مصروف تھا، جو کہ ۷۸۲ء تک جاری رہا۔ ساڑھے چار ہزار سیکسن قیدی بے رحمی سے شہر ورڈون میں قتل کر دیے گئے۔ ایران پر مزدکیہ کا زور تھا، جنھوں نے زن، زر، زمین کے وقفِ عام کر دینے سے انسانی و اخلاقی اقدار کو پامال کر دیا تھا۔ ہندوستان میں پرانوں کا دورِ اقتدار تھا، مندروں میں عورت و مرد کی برہنگی کی تمثیلیں بنا کے رکھی گئی تھیں اور ان کو پوجا جاتا تھا۔ عبادت خانوں میں ایسی فحش تصویریں آویزاں کی گئی تھیں، جن کے تصور سے کراہت محسوس ہوتی ہے۔ چین کے باشندوں نے اپنے ملک کو آسمانی فرزند کی بادشاہت سمجھ کر خدا کی ذات کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ انھوں نے ہر کام کے لیے الگ بت بنا رکھے تھے اور ان بتوں کو کام نہ ہونے کی صورت میں بادشاہ سزا دینے کا اختیار رکھتا تھا۔ مصر میں عیسائی مزہب کو عروج حاصل تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت اور ان کی ابنیت کی تعریف اور ان کے اختیارات کی حدود میں نئے نئے اعتقادات اور فرقے اختراع کیے جاتے تھے۔ ایک فرقہ دوسرے کو غلط ثابت کرنے اور اپنے مخالف کو بے دریغ مارنے اور آگ میں زندہ جلا دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ قاضی سلیمان نے یہ مختصر حالات ان حکومتوں اور ممالک کے درج کیے ہیں، جو خود کو علم و تہذیب کے دعویٰ دار قرار دیتے تھے۔[۵۱] عرب کے حالات کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

> عرب کا قیام انھی ممالک پر کر لیجیے اور قیاس کرتے ہوئے یہ بھی ملحوظ رکھیے کہ یہ ایسا ملک تھا کہ جہاں صدیوں سے نہ کسی بادشاہ کا تسلط ہوا تھا، نہ کوئی اثر قانون نے ڈالا تھا، نہ کوئی ہادی ان کی ہدایت کے لیے پہنچا تھا۔ اس حیوانی آزادی پر بے علمی، جہالت اور اقوام متمدنہ سے علیحدگی اور اجنبیت نے ان کی حالت کو اور بھی زیادہ تباہ کر دیا تھا۔ اس بدترین حالت ہی نے ان کو زیادہ تر واجب الرحم ٹھہرایا اور رب العالمین نے اصلاح عالم کا آغاز اسی جگہ سے ہونا پسند فرمایا۔[۵۲]

قاضی سلیمان نے رحمۃ للعالمین کی جلد اول میں عرب کے جغرافیائی محل و قوع، سیاسی، اخلاقی اور مذہبی صورت حال کو مختصراً بیان کیا ہے۔ انھوں نے اس دور کا نقشہ کھینچا ہے، جس کا براہِ راست تعلق آنحضرت ﷺ کی ولادت و بعثت سے ہے۔ اس لیے وہ عرب کی قدیم حکومتوں، اقوام و قبائل کا ذکر نہیں کرتے۔ اس کتاب میں سیرتِ محمدؐ کے ساتھ پیغامِ محمدؐ بھی پیش کیا گیا ہے تاکہ عرب کی بدلتی ہوئی صورت حال کو حیاتِ محمدؐ کے تناظر میں دیکھا جا سکے۔

۳۔ سیرۃ النبی ﷺ:

علامہ شبلی نعمانی کی سیرۃ النبی ﷺ کی جلد اول میں تاریخ عرب قبل از اسلام کے عنوان سے عرب کے جغرافیہ، قدیم تاریخ کے ماخذات، عرب کے اقوام و قبائل، عرب کی قدیم حکومتیں، تہذیب و تمدن، عرب کے مذاہب (نصرانیت، یہودیت، مجوسیت اور حنفیت)، اللہ کا اعتقاد جیسے موضوعات کو مختصر و جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ علامہ شبلی نے عرب کی وجہ تسمیہ اہلِ لغت کی رائے میں درج کی ہے۔ جن کے مطابق عرب اور اعراب کے معنی فصاحت وزبان آوری کے ہیں اور چوں کہ اہلِ عرب اپنی زبان آوری کے سامنے تمام دنیا کو ہیچ سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے خود کو "عرب" اور دیگر اقوام کو عجم (ژولیدہ زبان) کہہ کر مخاطب کیا۔ بعض اشخاص کی رائے ہے کہ عرب اصل میں عربۃ تھا۔ قدیم اشعار میں عرب کے بجائے عربۃ آیا ہے۔ علامہ شبلی نے ان عربی اشعار کو بھی درج کیا ہے۔ جن میں عرب کو عربۃ کہا گیا ہے۔

ورجت رباحۃ العربات رجًّا　　تر قرق فی منا کبھا الدماء

وغربۃُ ارض جد فی الشر اھلھا　　کما جد فی شرب النقاح ظماءُ

وعربۃ ارض مایحل حرامھا　　من الناس الا اللوز عی الحلاحل

عربۃ کے معنی سامی زبانوں میں دشت اور صحرا کے ہیں اور چوں کہ عرب کا بڑا حصہ دشت و صحرا ہے۔ اس لیے تمام ملک کو عرب کہا جانے لگا۔ (۵۳)

علامہ شبلی نعمانی نے عرب کے جغرافیہ کے متعلق لکھا ہے اور وہاں موجود معدنیات کا ذکر بھی کیا ہے، جو عربوں کے مالِ تجارت کا ایک بڑا حصہ تھیں۔ علامہ شبلی نے عرب کا حدودِ اربعہ لکھتے ہوئے اس کے مغرب میں بحیرہ قلزم، مشرق میں خلیج فارس اور بحر عمان، جنوب میں بحر ہند کی نشان دہی کی ہے۔ اس کے شمال کی حدود کو مختلف فیہ قرار دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ "بعض مملکت حلب اور فرات تک اس کی حدود کو وسعت دیتے ہیں"۔ علامہ شبلی نے جزیرہ سینا کے متعلق لکھا ہے کہ اکثر مصنفین عرب و یورپ اس جزیرہ جس کا نام "التیہ" ہے، کو مصر میں شمار کرتے ہیں لیکن جیالوجی کی رُو سے یہ عرب سے تعلق رکھتا ہے۔ شبلی کے مطابق عرب کی پیمائش باقاعدہ طور پر نہیں کی گئی۔ تاہم اس قدر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ جرمن و فرانس سے چوگنا وسیع ہے۔ طول تقریباً پندرہ سو میل، عرض چھ سو میل اور مجموعی رقبہ بارہ لاکھ مربع میل ہے۔ (۵۴)

عرب کا بڑا حصہ ریگستان پر مشتمل ہے، پورے ملک میں پہاڑوں کا سلسلہ موجود ہے۔ جن میں سب سے طویل پہاڑ جبل السُّراۃ ہے، جو جنوب میں یمن سے شروع ہو کر شمال میں شام تک چلا گیا ہے۔ اس کی سب سے اونچی چوٹی آٹھ ہزار فٹ بلند ہے۔ عرب کے کچھ حصے زرخیز و شاداب ہیں۔ یہاں چاندی اور سونے کی کانیں کثرت سے موجود ہیں۔ شبلی نعمانی نے علامہ ہمدانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب صفۃ جزیرۃ العرب میں ایک ایک کان کا نشان دیا ہے کہ وہ کس مقام پر موجود ہے۔ قریش تجارت کیا کرتے تھے اور مورخین نے ان کے مالِ تجارت میں زیادہ تر چاندی کی خرید و فروخت کو بیان کیا ہے کہ عرب چاندی کی تجارت کرتے تھے کیوں کہ ان کے یہاں یہ وافر مقدار میں موجود تھی۔(۵۵)

علامہ شبلی نے جلد اول کے باب "سلسلہ اسماعیلی" میں ان مباحث کو بیان کیا ہے کہ حضرت ہاجرہؑ و اسماعیلؑ عرب میں آباد ہوئے یا نہیں؟ اور حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحاقؑ کو قربان کرنا چاہا تھا یا حضرت اسماعیلؑ کو؟ علامہ شبلی نے تورات سفر پیدائش باب ۲۱ سے حوالہ دیا ہے کہ حضرت سارہؑ کے کہنے پر حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہؑ و اسماعیلؑ کو گھر سے لے کر نکلے اور انھیں وادی فاران میں آباد کیا۔ جب ابراہیمؑ نے انھیں گھر سے نکالا، تب اسماعیلؑ کا ختنہ ہو چکا تھا اور وہ پہلے انسان ہیں، جن کا ختنہ کیا گیا تھا، اس وقت ان کی عمر تیرہ برس تھی اور یہاں سے ختنہ کی رسم مسلمانوں میں آئی۔(۵۶)

علامہ شبلی نے تورات سے استناد کیا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ فاران میں رہے اور فاران عرب میں واقع ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ فاران اس صحرا کا نام ہے، جو فلسطین کے جنوب میں واقع ہے، اس لیے حضرت اسماعیلؑ کا عرب آنا خلافِ واقعہ ہے۔ علامہ جغرافیہ دانانِ عرب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ فاران حجاز کے پہاڑ کا نام ہے اور معجم البلدان میں اس کی وضاحت کی گئی ہے لیکن عیسائی مصنفین اس کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ علامہ نے اس بحث کو زیادہ طول نہیں دیا اور محض یہ لکھ دینے پر اکتفا کیا ہے کہ موسلولیبان تمدن عرب میں عرب کی حد شمالی کی وسعت کے متعلق لکھتے ہیں:

> اس جزیرے کی حد شمالی اس قدر صاف اور آسان نہیں ہے یعنی یہ حد اس طرح پر قائم ہوئی ہے کہ غزہ سے جو فلسطین کا ایک شہر اور بحر متوسط پر واقع ہے، ایک خط جنوب بحر لوط تک کھینچا جائے اور وہاں سے دمشق اور دمشق سے دریائے فرات تک اور دریائے فرات کے کنارے کنارے لا کر خلیج فارس میں ملا دیا جائے۔ پس اس خط کو عربستان کی حد شمالی کہہ سکتے ہیں۔(۵۷)

علامہ نعمانی نے لکھا ہے کہ اس بنیاد پر عرب کے حجازی حصہ کا فاران میں ہونا خلافِ قیاس نہیں ۔ تورات سفر تکوین باب ۲۵، آیت ۱۸ میں جہاں حضرت اسماعیلؑ کی جائے سکونت کا بیان ہے، وہاں یہ الفاظ درج ہیں" اور وہ حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راہ میں ہے، جس سے سور کو جاتے ہیں، بستے تھے۔"(۵۸) علامہ کے مطابق اس تحدید میں مصر

کے سامنے جو زمین پڑتی ہے، وہ عرب ہی ہو سکتا ہے۔ نصاریٰ کی مقدس کتابوں میں بنو اسرائیل کا ذکر موجود ہے انھوں نے بنو اسماعیل کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر کیا ہے۔ عہدِ جدید میں جس کو عیسائی وحی الٰہی سمجھتے ہیں، پولوس کا ایک خط گلیتون کے نام ہے، جس کی عبارت کو مصنف نے نقل کر کے ہاجرہؑ کا عرب میں قیام ثابت کیا ہے۔

> ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے۔ ایک لونڈی سے، دوسرا آزاد سے۔ پر وہ جو لونڈی سے تھا جسم کے طور پر پیدا ہوا اور جو آزاد سے تھا سو وعدے کے طور پر۔ یہ بات تمثیلی مانی جاتی ہے اس لیے کہ یہ عورتیں دو عہد ہیں۔ ایک تو سینا پہاڑ سے جو ہوا وہ نرے غلام جنتی ہے یہ ہاجرہ ہے کیوں کہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یروشلم کا جواب ہے۔ (۵۹)

اس عبارت کو درج کر کے علامہ اپنے شکوک کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگرچہ معلوم نہیں کہ اصل عبارت کیا تھی؟ کیوں کہ اس کا عربی و اردو ترجمہ واضح نہیں۔ تاہم یہ بات عیاں ہے کہ پولوس حضرت عیسیٰؑ کے جانشین تھے اور ان کا حضرت ہاجرہؑ کو کوہ سینا کہنا، ان کے مکہ میں عرب میں قیام کو ظاہر کرتا ہے۔ (۶۰) علامہ شبلی نے حضرت اسماعیل کے عرب اور خصوصاً مکہ میں قیام کو حضرت اسحاقؑ و اسماعیلؑ میں سے کون ذبیح اللہ تھا؟ کی بحث میں ثابت کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہودی گو حضرت اسحاقؑ کو ذبیح اللہ تسلیم کرتے ہیں مگر شریعتِ سابقہ میں جو شرائط درج ہیں، ان پر حضرت اسحاقؑ پورا نہیں اترتے۔ شریعتِ سابقہ میں صرف اس جانور یا انسان کی قربانی ہو سکتی ہے، جو پہلوٹا ہو اور اس بچہ کی افضلیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کیوں کہ تورات سفر تثنیہ باب ۲۱، آیت ۱۵، ۱۷ میں درج ہے "کیوں کہ وہ اس کی پہلی قدرت ہے اور اسی کو اولاد اولین ہونے کا حق ہے"۔ (۶۱) حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس میں یہ قید تھی کہ وہ بیٹا قربان کیا جائے جو اکلوتا و محبوب ہو اور اس وقت حضرت اسحاقؑ کی پیدائش نہیں ہوئی تھی، اسی وجہ سے اسماعیلؑ ہی ذبیح اللہ ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں بیٹے کی قربانی کا حکم ہوا تھا، جس سے مراد یہ تھا کہ بیٹے کو معبد کی خدمت کے لیے نذر چڑھا دیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے پہلے اس خواب کو عینی و حقیقی سمجھا اور اس کے مطابق عمل کیا لیکن ان پر واضح ہو گیا کہ یہ ایک تمثیلی خواب تھا اور اس قربانی سے مراد خانہ خدا کی خدمت کے لیے اپنے فرزند کو خاص کرنا تھا۔ (۶۲)

علامہ شبلی نے ذبیح اللہ کی بحث میں ہی قربانی کے مقام کا تعین کیا ہے، جس سے حضرت اسماعیلؑ کے قیامِ مکہ اور خانہ کعبہ کا بیت اللہ ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ یہ نکتہ جغرافیہ سیرت میں نہایت اہم ہے کیوں کہ اس سے محمدؐ کا نسلِ اسماعیل سے ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ تورات میں قربانی کا جو مقام بتایا گیا ہے وہ "مریا" ہے۔ یہودیوں کے مطابق یہ وہ جگہ ہے جہاں سلیمانؑ کا ہیکل ہے اور عیسائیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ جس جگہ حضرت عیسیٰؑ کو سولی دی گئی، وہاں قربانی کی گئی تھی۔ علامہ شبلی نے ان دونوں مذاہب کے پیروکاروں کی راے کو یورپی محقق سر اسٹائلی کے الفاظ درج کر کے رد کیا ہے:

> حضرت ابراہیمؑ صبح کے وقت اپنے خیمہ سے نکل کر اس مقام پر گئے جہاں ان کو خدا نے حکم دیا تھا لیکن یہ موریا کا پہاڑ نہیں ہے جیسا کہ یہود کا دعویٰ ہے، نہ عیسائیوں کے خیال کے موافق قبر مقدس کے گرجا کے پاس ہے۔ یہ قیاس تو یہودیوں کے قیاس سے بھی بعید ہے اور اس سے بعید مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ وہ جبل عرفات ہے۔ غالباً یہ مقام جزیریم کے پہاڑ پر ہے اور وہی قربانی گاہ سے مشابہ مقام ہے۔[۶۳]

علامہ شبلی نے یہاں یہ راے دی ہے کہ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ موریا کے تعین میں یہود و نصاریٰ کا خیال غلط ہے البتہ مسلمان جبلِ عرفات کو نہیں بل کہ منیٰ کو قربانی گاہ سمجھتے ہیں۔ انھوں نے تورات کے حوالے سے لکھا ہے "اور مدیانیوں کی فوج شمال کی جانب مورہ کی پہاڑی پر وادی میں تھی"۔[۶۴] یہ الفاظ درج کرنے کے بعد وہ مدیان کا عرب میں واقع ہونا بیان کرتے ہیں اور لفظ "مورہ" کو "مروہ" کہتے ہوئے، اپنے اس نکتے کو پیش کرتے ہیں کہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مروہ کی جانب اشارہ کر کے فرمایا" قربانی گاہ یہ ہے اور مکہ کی تمام پہاڑیاں اور گھاٹیاں قربانی گاہ ہیں۔"[۶۵] اس سے حضرت اسماعیل کا مکہ میں آنا اور یہاں ابراہیمؑ کی ان کی قربانی کرنا ثابت ہوتا ہے۔ علامہ نے لکھا ہے" مروہ بالکل کعبہ کے مقابل اور اس کے قریب ہے۔ ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قربانی کی اصلی جگہ کعبہ ہے منیٰ نہیں لیکن حجاج کی کثرت ہوئی تو کعبہ کے حدود کو منیٰ تک وسعت دے دی گئی۔"[۶۶]

علامہ شبلی نے حضرت اسماعیلؑ کے مسکن کی بحث کو مزید "مکہ معظمہ" کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ متعصب عیسائی مورخ لکھتے ہیں کہ مکہ قدیم شہر نہیں ہے، مسلمانوں کو اس کی قدامت کا دعویٰ ہے، قدیم تاریخوں میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ علامہ شبلی نے اس خیال کو رد کرتے ہوئے، مکہ کا قدیم نام "بکہ" بتایا ہے اور سورۃ آلِ عمران کی آیت نمبر ۹۶ سے اپنے موقف کی تائید کی ہے۔ "ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا (پہلا متبرک گھر جو آدمیوں کے لیے بنایا گیا وہ بکہ میں تھا)"۔ قرآن مجید سے دلیل دینے کے بعد وہ کتاب زبور سے حوالہ دیتے ہیں "بکہ کی وادی سے گزرتے ہوئے اسے ایک کنواں بتاتے، برکتوں سے مورۃ کو ڈھانک لیتے۔ قوت سے قوت تک ترقی کرتے چلے جاتے ہیں"۔[۶۷]

علامہ شبلی نے اس مقام پر لفظ "بکہ" سے بحث کی ہے کہ زبور میں جس وادی بکہ کا ذکر ہے، وہ یہی مکہ مکرمہ ہے اور "اگر اس لفظ کو اسم علم کے بجائے مشتق قرار دیں تو اس کے معنی "رونے" کے ہوں گے اور یہ وہی عربی لفظ بکا ہے"۔ علامہ کے نزدیک چوں کہ یہود و نصاریٰ مکہ کی وقعت کو کم کرنے کی کوشش کرتے تھے، اسی وجہ سے انھوں نے زبور میں موجود لفظ کا ترجمہ رونا کر دیا۔[۶۸]

اسی باب میں علامہ شبلی نے مارگولیوس کے اس اعتراض کو رد کیا ہے کہ مسلمان اپنے مذہبی مرکز کو سب سے قدیم قرار دیتے ہیں جب کہ مکہ کی سب سے قدیم عمارت محمدؐ کے صرف چند پشت قبل تعمیر ہوئی تھی۔(۶۹) علامہ نے اس ضمن میں یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ مارگولیوس نے جس بنیاد پر مکہ کی قدامت سے انکار کیا ہے، وہ یہ ہے کہ مکہ میں سب سے پہلی عمارت سعید یا سعد بن عمرو نے تعمیر کی لیکن انھیں یہ معلوم نہیں کہ مورخین نے جابجا یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ اہلِ عرب کعبہ کے مقابل یا اس کے آس پاس عمارات بنانے کو بے ادبی گردانتے تھے، اس لیے وہاں عمارتیں تعمیر نہیں کی جاتی تھیں۔ اہلِ مکہ خیموں میں رہتے تھے اور اسی وجہ سے یہ خیموں سے آباد ایک وسیع ملک تھا۔(۷۰)

علامہ شبلی نے اپنے نقطہ نظر کی صداقت کو بیان کرنے کے لیے کارلائل کی کتاب ہیرو اینڈ ہیرو شپ سے حوالہ دیا ہے" رومن مورخ سیسلس نے کعبہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ دنیا کے تمام معبدوں سے قدیم اور اشرف ہے اور یہ ولادت مسیحؑ سے پچاس برس پہلے کا ذکر ہے۔"(۷۱) اسی کے ساتھ وہ معجم البلدان کے حوالے سے لکھتے ہیں "مکہ معظمہ کا عرض اور طول بطلیموس کے جغرافیہ میں حسبِ ذیل ہے: طول ۷۸ درجہ، عرض ۳ درجہ"۔(۷۲) علامہ شبلی نے ان حوالوں سے اپنے اس نقطہ نظر کی توثیق کی ہے کہ مکہ جس کو زبور اور قرآن مجید میں "بکہ" کہا گیا ہے، ایک قدیم شہر ہے جہاں خانہ کعبہ دنیا میں رب تعالیٰ کا قدیم ترین گھر موجود تھا۔

علامہ شبلی نے سیرۃ النبی ﷺ کی جلد اول میں عرب کی تاریخ کے قدیم ماخذات کی بھی نشان دہی کی ہے تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ عرب کی قدیم تاریخ کن کن ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے۔ انھوں نے قبل از اسلام عرب کی تاریخ کے مآخذ کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جو درج ذیل ہیں:

۱۔ زمانہ جاہلیت کی چند تصانیف سلاطین حیرۃ کے کتب خانہ میں محفوظ تھیں، جو ابنِ ہشام کو ملیں اور ان کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب التیجان میں کیا۔

۲۔ عرب قوم کا حافظہ بہت قوی تھا۔ ہر قبیلے نے اپنا شجرہ نسب زبانی یاد رکھا ہوا تھا، جو نسل در نسل زبانی روایت کی صورت میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا۔ عربوں کے زمانہ جاہلیت کے اشعار جن کا وسیع ذخیرہ آج تک موجود ہے، زبانی روایت کی صورت میں اسلام کے زمانہ تک آیا۔ عربوں کی معدوم شدہ قوموں طسم، جدیس، عاد و ثمود وغیرہ کے متعلق زبانی روایتیں محفوظ تھیں، جن کو مدِ نظر رکھ کر مورخین اسلام نے عرب کی تاریخ پر کتابیں لکھیں۔ جس کی مثال ہشام کلبی کی کتابوں سے دی جاسکتی ہے، جو انھوں نے طسم، جدیس، تبابعہ، یمن اور دیگر سلاطین عرب کے حوالے سے لکھی ہیں۔

۳۔ اشعارِ جاہلیت جن میں اکثر سلاطین، اقوام اور عماراتِ عرب کا ذکر ہے۔ یہ اشعار صفتہ جزیرۃ العرب اور معجم البلدان میں کثرت سے نقل کیے گئے ہیں۔ انہی قدیم ماخذوں سے علامہ ہمدانی نے اپنی کتاب الاکلیل مرتب کی ہے۔ جس کا آٹھواں باب سلاطین حمیر کے آثاراتِ قدیمہ اور حمیری کتبات پر مشتمل ہے۔

۴۔ یورپ کی قدیم تصنیفات مثلاً مصنفین یونان نے تھیو فراسٹس (جو حضرت عیسیٰؑ سے چار سو برس قبل تھا) سے لے کر بطلیموس تک بہت سے قبائل عرب کے نام لکھے ہیں اور ان کی آبادیوں کے نام بھی بتائے ہیں، رومن مورخ پلینی نے بھی عرب کے متعلق مختصراً لکھا ہے۔

۵۔ عرب کی قدیم ویران شدہ عمارتوں کے کتبات جو قدمائے اسلام نے دریافت کیے تھے اور جو آج کل یورپ نے نہایت کثرت سے مہیا کیے ہیں۔[۷۳] تاریخِ عرب کو جاننے کے اہم ذریعے ہیں۔

علامہ شبلی نے ان پانچ نکات کی صورت میں عرب کی تاریخ کے متعلق حاصل کیے جانے والے ذرائع کا ذکر کیا ہے۔ خود انھوں نے سیرۃ النبی ﷺ میں عرب کی تاریخ کو نہایت مختصر بیان کیا ہے۔ اس سے ان کا مقصود ایک خاکہ تشکیل دینا تھا، جس میں قبل از اسلام عرب کی مجموعی صورت کا احوال درج کرنا تھا، تاکہ قارئینِ سیرت اس ماحول سے آگاہ ہو جائیں جہاں اسلام اور آخری پیغمبر کا ظہور ہوا اور دنیا کے منظر نامے میں کئی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

علامہ شبلی نے عرب کے اقوام و قبائل کی وہی تقسیم بیان کی ہے، جو ہر کتابِ سیرت میں درج ہے۔ مورخینِ عرب نے اقوامِ عرب کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ عربِ بائدہ: عرب کے قدیم قبائل جو قبل از اسلام فنا ہو چکے تھے۔ عربِ عاربہ: بنو قحطان جو عرب بائدہ کے بعد عرب کے اصلی باشندے تھے، جن کا اصل مسکن ملکِ یمن تھا اور عربِ مستعربہ: بنو اسماعیل یعنی حضرت اسماعیلؑ کی اولاد جو حجاز میں آباد تھی۔ اس کے علاوہ تین بڑے یہودی قبائل بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ بھی عرب میں آباد تھے۔[۷۴]

علامہ شبلی نے عرب کی قدیم حکومتوں کا بھی ذکر کیا ہے کہ اسلام سے قبل عرب میں پانچ متمدن سلطنتیں گزریں۔ جن میں معینی: معین یمن میں ایک مقام کا نام ہے، جو کسی زمانہ میں سلطنت کا پایہ تخت تھا۔ سبائی: یعنی قومِ سبا۔ حضر موتی: حضر موت یمن کا مشہور مقام ہے۔ قتبانی: قتبان عدن میں ایک مقام ہے جو آج کل گمنام ہے۔ نابتی: حضرت اسماعیلؑ کے ایک بیٹے کا نام تھا، یہ سلسلہ انہی کی طرف منسوب ہے، شامل ہیں۔ علامہ شبلی نے ان حکومتوں کا مختصر احوال بھی درج کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ معینی سلطنت جنوبی عربستان میں تھی۔ کتبوں سے اس کے تقریباً پچیس حکمرانوں کا پتہ چلتا ہے۔ یورپی محققین کا اس ضمن میں اختلاف ہے کہ معینی اور سبائی حکومتیں ہم زمان تھیں یا متقدم و متاخر۔ گلازر کا خیال ہے

کہ معینی حکومت بہت متقدم ہے اور حضرت عیسیٰؑ سے پندرہ سو برس قبل موجود تھی لیکن مولر کا بیان ہے کہ کوئی معینی کتبہ آٹھ سو برس قبل مسیح سے پہلے کا نہیں ملتا، اس بنا پر سبائی اور معینی دونوں ہم عصر ہیں۔(۷۵)

علامہ شبلی نے عرب کی قدیم حکومتوں کا احوال کتبوں اور یورپی محققین کی آرا کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا ہے۔ وہ سبائی دور کے متعلق لکھتے ہیں کہ "جیسا کہ کتبوں سے ثابت ہوتا ہے، حضرت عیسیٰؑ سے سات سو برس قبل ہے۔ اس سلطنت کا پایہ تخت مآرب تھا، اس زمانہ کے سنگی کتبے بکثرت موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ سے ایک سو پندرہ برس قبل تک اس حکومت کا پتہ چلتا ہے۔ اس دور کے بعد حمیر کا زمانہ ہے۔ حمیر نے مآرب پر قبضہ کر کے اس کو پایہ تخت بنالیا۔"(۷۶) شبلی نے کتبوں کی رُو سے لکھا ہے کہ حمیر کے چھبیس حکمران گزرے ہیں۔ ان کے عہدِ حکومت میں رومی سلطنت نے عرب میں مداخلت کرنے کی کوشش کی۔ جو اس کی پہلی و آخری سعی ثابت ہوئی۔ اے لیس گالس 'جس نے حضرت عیسیٰؑ سے ۱۸ برس قبل عرب پر چڑھائی کی تھی، وہ بھی بالکل ناکام رہا۔ اس کے راستہ بتانے والے کھوجی اسے صحرا میں لے گئے اور عرب کے ریگستان میں اس کا سارا لشکر تباہ و برباد ہو گیا۔(۷۷)

علامہ شبلی کے قلم کا یہ اختصاص ہے کہ انھوں نے بعثتِ محمد رسول اللہ ﷺ سے قبل عرب کی قدیم حکومتوں کا احوال سمندر کو کوزے میں بند کر دینے کے مترادف بیان کیا ہے۔ ان حکومتوں کے متعلق لکھتے ہوئے، انھوں نے جدید طریق تحقیق یعنی کتبوں اور یورپی محققین کی آرا کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ عربوں کی روایات کو بھی اہمیت دیتے ہیں کیوں کہ قدیم عرب کے بارے میں زبانی روایتوں میں اہم واقعات اور تاریخی حقائق کو بیان کیا جاتا رہا ہے۔ عربوں کا حافظہ بہت قوی تھا، اسی وجہ سے ان کی یہ روایتیں نسل در نسل، سینہ بہ سینہ اگلی پشتوں میں منتقل ہوتی رہی ہیں اور انھیں عرب تاریخ جاننے کا ایک بڑا ذریعہ تصور کیا جاتا رہا ہے۔

عرب روایات کے تناظر میں علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ سبا و حمیر کی حکومت اور ان کی فتوحات کے متعلق عرب میں متواتر روایات ہیں اور ان کی قدرِ مشترک سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ عربی اشعار میں بھی ان کے واقعات کثرت سے مذکور ہیں۔ عربوں کے خیال میں سلاطین حمیر نے ایران کے انتہائی مقامات فتح کر لیے تھے۔ ذوالقرنین جس کو عوام سکندر کہتے ہیں۔ اہلِ عرب کے نزدیک اس کا تعلق حمیری خاندان سے تھا۔ شاہ نامہ میں مذکور ہے کہ کیکاؤس کو شاہ ہاما دران نے گرفتار کر لیا تھا۔ علامہ ثعلبی نے تاریخ ایران میں لکھا ہے کہ ہاما دران حمیر کا بادشاہ تھا اور ہاما دران دراصل وہی عربی حمیر ہے۔ علامہ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ سودابہ کو کیکاؤس کی زوجہ تھی اور فردوسی کے بیان کے موافق سیاوش پر عاشق ہو گئی تھی، اسی حمیری بادشاہ کی بیٹی تھی۔ اس کا اصلی نام سعدی تھا۔ ایرانیوں نے اپنے تلفظ میں اس کو سودابہ کر لیا تھا۔(۷۸) علامہ شبلی نے سبا اور حمیر کے دورِ اقتدار میں ان کے اعلیٰ تمدن کو مشہور مستشرق نولدیکی کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> ولادت مسیح سے ہزار سال قبل جنوبی و غربی عرب یعنی یمن جو حمیر اور سبا کا ملک تھا اور جو اپنی بارش گرما کے باعث زراعت کے لیے نہایت موزوں تھا'تمدن کے اس رتبہ تک پہنچ چکا تھا کہ کثیر التعداد کتبات اور شاندار عمارات کے آثار سے آج بھی ہمارے جذبات مدح و ستائش کو تحریک ہوتی ہے اور اہلِ یونان و روم نے اس کو "دولت مند عرب" کا جو لقب دیا تھا وہ بیجا نہ تھا۔۔۔تورات میں متعدد عبارتیں ہیں جو سبا کی عظمت و شوکت کی شہادت دیتی ہیں۔ چنانچہ ملکہ سبا کا سلیمان سے ملاقات کا قصہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔(۷۹)

حمیر و سبا کے علاوہ نابتی حکومت جو شام کے حدود سے متصل تھی اور جس میں قومِ ثمود کی خوبیاں پائی جاتی تھی، قومِ نابت کو قومِ ثمود کا قائم مقام بھی کہا جاتا تھا کیوں کہ ان کا تمدن اور عمارتیں بنانے کا انداز ان سے ملتا جلتا تھا۔ اس قوم کی نسبت فارسٹر کی رائے کو علامہ شبلی نے نقل کیا ہے، جس کو ذیل میں درج کیا گیا ہے تا کہ عرب کی قدیم حکومتوں میں نابتی قوم کا حال معلوم کیا جا سکے، جس کا بنو اسماعیل سے براہِ راست تعلق تھا کیوں کہ نبی آخر الزمان بھی اسی نسل سے تھے۔ فارسٹر لکھتے ہیں:

> زمانہ قدیم میں نابت کا نام اور اثر نہ صرف ریگستانی اور صحرائی عرب پر مستولی تھا بلکہ حجاز و نجد کے صوبہ ہائے عظیمہ پر بھی حاوی تھا۔ نابتی جہاں ایک منافع تجارت سے بہرہ ور ہونے میں کمال رکھتے تھے۔ دوسری طرف سچے بطور بنو اسمٰعیل کے خطرات جنگ کے لیے بالکل مستعد رہتے تھے۔ فلسطین و شام میں ان کی غارت گریوں اور خلیج میں مصری جہازات پر ان کی رہزنی نے بارہا تاجداران مقدونیہ کو ان کی دشمنی پر آمادہ کر دیا لیکن روما کی مجموعی قوت سے پیشتر کوئی شے انہیں روک نہ سکی اور روما کی اطاعت بھی انہوں نے اسٹرابو کے زمانہ میں بالکل مجبورانہ اور مشتبہ انداز سے قبول کی۔(۸۰)

علامہ شبلی نے عرب کی قدیم سلطنتوں کا احوال درج کیا ہے۔ یہ تمام حکومتیں اسلام کی آمد سے پہلے ختم ہو چکی تھیں اور ان سلطنتوں کے آثار بھی واضح نہ تھے۔ یمن میں صرف بڑے بڑے سردار رہ گئے تھے، جن کو قیل یا مقول کہا جاتا تھا۔ عراق میں آل منذر کا خاندان قائم تھا، جو مکمل خود مختار نہیں تھا بلکہ فارس کے زیرِ اثر تھا۔ شام کے حدود میں غسانی خاندان فرمان

رواتھا۔جو قیصر روم کے ماتحت تھا،اس خاندان کا آخری فرمان روا جبلہ بن الایہم غسانی تھا۔[۸۱] یہ عرب کی قدیم حکومتیں تھیں، جو اسلام سے بہت پہلے روبہ زوال تھیں۔ بعثتِ رسول ﷺ نے عرب کی سیاسی صورت حال کو بدل کے رکھ دیا ۔علامہ شبلی نے اس موضوع کو سیرتِ محمدؐ کے تناظر میں بیان کیا ہے۔

عرب کے تہذیب و تمدن کا قبل از بعثتِ رسول ﷺ مطالعہ بھی سیرتِ رسول اللہؐ کا بنیادی حصہ ہے۔اس سے سیرت نگاروں کا مقصد عرب کے اخلاقی و سماجی حالات کا جائزہ پیش کرنا ہے تاکہ قاری حیاتِ محمدؐ کے مطالعہ سے قبل عرب کی تہذیب اور اس کے طرزِ معاشرت سے واقف ہو سکے اور آمدِ رسول اللہؐ اور ان کی مبلغانہ کاوشوں سے عرب کے بدلتے ہوئے حالات کا خود تجزیہ کر سکے۔

علامہ شبلی نعمانی نے عرب کی تہذیب و تمدن کے حوالے سے لکھا ہے کہ عرب کے مختلف حصے تہذیبی ترقی میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔وہ موسیو لیبان فرنساوی کی رائے درج کرتے ہیں کہ " اسلام سے پہلے عرب کا تمدن کسی زمانہ میں اوجِ کمال تک پہنچا تھا کیوں کہ اصولِ ارتقا کی رو سے کوئی قوم محض وحشت کی حالت سے دفعتاً اعلیٰ درجہ کی تہذیب و تمدن تک نہیں پہنچ سکتی۔[۸۲] علامہ شبلی اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ صرف قیاسی استدلال ہے۔تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ عرب کے بعض حصے جن میں یمن کا خصوصی ذکر ہے،سبائی حکومت کے دور میں ترقی کی انتہا پر پہنچ چکے تھے مگر اس میں پورا عرب شامل نہیں۔یمن کے علاوہ عرب کے وہ مقامات جو ایران اور شام سے متصل تھے مثلاً حیرہ جو آلِ نعمان کا پایہ تخت تھا اور حوران جو خاندانِ غسان کا صدرِ مقام تھا،وہاں تہذیب و تمدن کا اعلیٰ معیار موجود تھا مگر ان علاقوں کی تمدنی زندگی کو پورے عرب کا تمدن قرار نہیں دیا جا سکتا۔[۸۳] علامہ شبلی نے یہاں یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ عرب کے اصلی اور اندرونی مقامات میں تہذیب و تمدن ترقی پذیر تھا۔عربی زبان کی تمام تر وسعت کے باوجود جن چیزوں کا تمدن اور اسبابِ معاشرت سے براہِ راست تعلق ہے،ان کے لیے خاص عربی زبان میں الفاظ ناپید تھے۔عربوں نے اپنی ضرورت کے کئی الفاظ ایران یا روم سے مستعار لیے۔علامہ شبلی نے ان الفاظ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :

> عربی میں سکہ کے لیے ایک بھی لفظ موجود نہیں ہے ۔ درہم اور دینار دونوں غیر زبان کے الفاظ ہیں۔ درہم یونانی لفظ درخم ہے اور یہ وہی لفظ ہے جو انگریزی میں ڈرام ہو گیا۔ چراغ معمولی چیز ہے۔ تاہم اس کے لیے عربی میں کوئی لفظ نہ تھا، چراغ کو لے کر سراج کر لیا۔ پھر ایک مصنوعی لفظ بنایا'مصباح یعنی ایک آلہ ہے جس سے صبح بنالی جاتی ہے۔کوزہ کے لیے کوئی لفظ نہیں۔کوزہ کو کوز کر لیا ہے۔لوٹے کو ابریق کہتے ہیں جو آب ریز کا معرب ہے۔ تشت فارسی لفظ تھا اسی کو عربی میں طست کر لیا ہے۔پیالہ کو کاس کہتے

ہیں 'وہی کا سہ فارسی لفظ ہے 'کرتہ کو عربی میں قرطق کہتے ہیں۔ یہ بھی فارسی ہے 'پائجامہ کو سروال کہتے ہیں جو شلوار کی بگڑی صورت ہے۔(۸۴)

علامہ شبلی کے مطابق جب ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے عربی زبان میں الفاظ کی کمی تھی تو ان کے پاس ترقی یافتہ صورت میں تہذیب و تمدن کی شکل کیسے دیکھی جاسکتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب نے جو کسی زمانہ میں ترقی کی تھی، وہ آس پاس کے ممالک سے متاثر شدہ تھی۔ اس کے اثرات ان عرب علاقوں پر نہیں پڑے، جو ان سے دور تھے۔ یہ عرب علاقے ترقی کی رفتار سے بہت دور اور پیچھے تھے۔ شبلی نعمانی نے احادیثِ صحیحہ کا حوالہ دیا ہے کہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے زمانہ تک عیش و عشرت کے سامان بہت کم اہلِ عرب کو دستیاب تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> مسئلہ حجاب کے شان نزول میں بخاری وغیرہ میں مذکور ہے کہ اس زمانہ تک گھروں میں جائے ضرور نہ تھی۔ مستورات رفع حاجت کے لیے باہر جایا کرتی تھیں۔ ترمذی باب الفقر میں ہے کہ اس وقت تک چھلنیاں نہ تھیں۔ بھوسے کو پھونک کر اڑاتے تھے جو رہ جاتا تھا وہی آٹا ہوتا تھا۔ بخاری کی ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ راتوں کو گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے۔ ابوداؤد میں ایک صحابی کی روایت ہے کہ میں آنحضرت ﷺ کی صحبت میں تھا لیکن میں نے آپؐ سے حشرات الارض کا حرام ہونا نہیں سنا۔ اگرچہ اس حدیث کی شرح میں محدثین لکھتے ہیں کہ ایک راوی کے نہ سننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعی میں آنحضرت ﷺ نے حشرات الارض کی حرمت بیان نہیں کی لیکن اس سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب حشرات الارض کھاتے تھے۔ تاریخ اور ادب میں بتصریح موجود ہے کہ عرب کنکھجورا، گوئے، گرگٹ، سہی اور جانوروں کا چمڑا کھاتے تھے۔(۸۵)

علامہ شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی ﷺ میں اسلام کے ظہور سے قبل مختلف مذاہب کی موجودگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ عرب میں بت پرستی کا عام رواج تھا اور چند قبائل نے اپنی عبادت کے لیے بُت بھی مخصوص کیے ہوئے تھے اور ان بُتوں کو ایک خاص مقام پر نصب کیا گیا تھا۔ علامہ شبلی نے ان کی تفصیل درج کی ہے۔ مثلاً طائف کے مقام پر "لات" کو نصب کیا گیا تھا، جس کی عبادت قبیلہ ثقیف کرتا تھا۔ مکہ مکرمہ میں قریش و کنانہ عزیٰ کی پرستش کرتے تھے اور مدینہ منورہ میں اوس، خزرج اور غسان "منات" کو پوجتے تھے۔ مکہ میں خانہ کعبہ کی چھت پر "ہبل" کو لگایا گیا تھا۔ قریشِ مکہ لڑائیوں

میں اس کی "ہے" پکارتے تھے۔علامہ شبلی نے عرب میں رواج پانے والی بُت پرستی کی وجہ یاقوت حموی کی کتاب معجم البلدان سے نقل کی ہے کہ عرب میں بت پرستی اس وجہ سے عام ہوگئی کہ عرب کے قبائل جو مختلف اطراف سے حج کی غرض سے آتے تھے ،وہ واپس جاتے ہوئے حرم کے پتھروں کو ساتھ لے جاتے تھے اور ان کی پرستش کرتے تھے۔(۸۶) مکہ کو پورے عرب میں مرکزیت حاصل تھی۔ یہاں "ہبل" کی تنصیب نے اہلِ عرب کے دلوں میں بُتوں کی عظمت کو ابھارا۔وہ ان بے جان مٹی کے بنے بُتوں کو اپنا حاجت روا تسلیم کرنے لگے اور ان کے ذریعے اپنی مشکلات کا حل تلاش کرنے لگے لیکن یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ اہلِ مکہ ان بُتوں کو وسیلہ سمجھتے تھے اور اس بات کا اعتقاد رکھتے تھے کہ ایک اصلی خالق و مالک موجود ہے اور یہ بُت کائنات کا نظام چلانے کے لیے اس کے مدد گار ہیں۔

عرب کی تاریخ میں دینِ ابراہیمی کے دھندلے نقوش بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جس کا بنیادی اصول "توحید" تھا ۔خانہ کعبہ میں بُتوں کی پرستش کی جاتی تھی،اس کے باوجود مکہ میں ایسے اشخاص بھی تھے جو ہر بُت سے بے گانہ ایک خدا کو مانتے تھے اور خود کو "حنیف" کہتے تھے۔ عرب خصوصاًمکہ و مدینہ میں کئی افراد بُت پرستی سے منکر ہو کر ملتِ ابراہیمی کی تلاش میں تھے اور جانتے تھے کہ یہاں "مجدد ملتِ ابراہیمی" کے ظہور کا وقت قریب ہے۔شبلی نے تمام عرب میں یہودیت،نصرانیت اور عیسائیت کے ہونے کا تذکرہ بھی کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ سوال اٹھایا ہے کہ عرب میں ان تمام مذاہب کی موجودگی سے ان کے اخلاقی و مذہبی معاملات میں نکھار پیدا ہونے کے بجائے بگاڑ کی صورت حال نے جنم لیا۔بتوں کو انسانی جان کا نذرانہ پیش کیا جاتا تھا اور بیٹیوں کو پیدا ہوتے ساتھ ہی دفن کر دیا جاتا تھا۔باپ کی وفات کے بعد بیٹا اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کر لیتا تھا اور بیک وقت دو حقیقی بہنوں سے شادی جائز تصور کی جاتی تھی۔ ازدواج کی کوئی ایک حد معاشرتی طور پر مقرر نہیں تھی اور قمار بازی، جوا، شراب خوری، بدکاری کو عیب یا غلط افعال نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بے حیائی کی انتہا یہ تھی کہ امرا القیس جس کو عربی زبان کا نامور شاعر سمجھا جاتا ہے۔اس نے ایک قصیدہ میں اپنی پھوپھی زاد کے ساتھ بدکاری کے قصے کو لکھا، جس کو خانہ کعبہ کی دیوار پر آویزاں کیا گیا۔(۸۷) جنگوں میں قیدیوں کو زندہ جلا دیا جاتا تھا اور حاملہ عورتوں کے پیٹ تک چاک کر دیے جاتے تھے۔ بچوں کو قتل کرنا اور املاک کو نقصان پہنچانا ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ علامہ شبلی نے یہاں عیسائیوں کے اس خیال کو پیش کیا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب سب سے زیادہ عیسائیت سے متاثر تھا۔ وہ اس پر اپنی رائے درج کرنے کے بجائے ولیم میور کے نقطہ نظر کو اس تناظر میں بیان کر کے اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔ ولیم میور نے دی لائف آف محمد کے دیباچے میں لکھا ہے کہ

> عیسائیوں نے عرب کو پانچ سو برس تعلیم و تلقین کی اس پر بھی خال خال عیسائی نظر آتے تھے یعنی بنو حارث نجران میں،بنو حنیف یمامہ میں اور کچھ بنی طے میں عیسائی تھے۔ بالآخر عرب کو من حیث المذہب دیکھیے تو اس کی سطح پر عیسائیوں کی ضعیف کوششوں کی کچھ خفیف سی موجیں لہراتی نظر آتی

تھیں اور یہود کی قوت بھی کبھی شدت سے طغیانی کرتی نظر آتی تھی لیکن
بت پرستی اور بنو اسماعیل کے بے ہودہ اعتقادات کا دریا ہر سمت سے جوش
مارتا ہوا کعبہ سے آکر ٹکراتا تھا۔(۸۸)

علامہ شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی ﷺ میں عرب کے جغرافیائی ماحول، وہاں کی تہذیب و معاشرت اور مختلف مذاہب کی تعلیمات کو مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ جس کے مطالعے سے قاری بعثتِ رسول ﷺ سے قبل عرب کے حالات کو بخوبی جان سکتا ہے۔ نو آبادیاتی سیرت نگاروں نے سیرت کے اس پہلو کو درخورِ اعتنا سمجھا کیوں کہ اس کے بیان سے حیاتِ محمد ﷺ کی اہمیت کو واضح کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح آپؐ کے اخلاق و کردار اور تعلیمات سے عرب میں چھائے تاریکی کے بادل چھٹ گئے اور جہالت میں ڈوبے عرب دنیا کو تہذیب و شائستگی سکھانے کا سبب بنے۔

۴۔ خطباتِ مدراس:

سید سلیمان ندوی نے تقریری طور پر آٹھ خطبات سیرتِ رسول ﷺ پر پیش کیے، جنھیں بعد میں تحریری صورت میں شائع کیا گیا۔ ان خطبات کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں روایتی سیرت نگاری کے مناہج و اسالیب کے بجائے منطقی و سائنسی طرزِ استدلال کو اپنایا گیا اور حیاتِ محمد کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ اور پیغامِ محمدؐ کو اجاگر کرنے پر زیادہ توجہ صرف کی گئی۔ سید سلیمان ندوی نے واقعاتِ سیرت کے بیان کے بجائے حیاتِ محمد کے دنیا پر اثرات کا جائزہ لیا۔ اسی لیے انھوں نے جغرافیہ سیرت اور عرب کے تہذیبی و معاشرتی زندگی کو اپنا بنیادی موضوع نہیں بنایا۔ وہ اپنی کتاب کے آخری خطبہ "پیغامِ محمدیؐ" میں عرب کی تہذیب کی جانب خفیف سا اشارہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی پیغامِ محمدؐ سے پیدا ہونے والے انقلاب کو بھی بیان کر دیتے ہیں۔ ان کا یہ انداز نو آبادیاتی سیرت نگاروں سے مختلف ہے۔ جنھوں نے جغرافیہ عرب اور تہذیبی عوامل کا الگ سے ذکر کیا ہے اور ان میں آپؐ کی تعلیمات سے پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو موضوعِ سخن نہیں بنایا ہے۔

سید سلیمان ندوی نے آخری خطبہ میں لکھا ہے کہ عربوں کے یہاں دیوی دیوتاؤں کو انسانی جان کی قربانی دینے کا رواج تھا۔ وہ اولاد کو اپنی ذاتی ملکیت تصور کرتے تھے، اسی وجہ سے ان کو دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دیتے تھے، یہودی قربانی کے گوشت کو جلا دیتے تھے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کی قربانی کا تصور جڑ سے مٹا ڈالا اور قربانی کو صرف اللہ تعالیٰ کی خوش نودی حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا۔ انسانی قربانی سے یہ تصور پیدا ہو گیا تھا کہ انسان اپنی جان پر قابو رکھتا ہے اور جب چاہے اسے ختم کرنے کا اختیار رکھتا ہے جب کہ نبی اکرمؐ نے اس خیال کی بیخ کنی کی اور عرب سمیت پوری دنیا کو یہ پیغام دیا کہ انسانی جان کا اصل و حقیقی مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔(۸۹)

سید سلیمان ندوی نے عرب معاشرت میں دُخترکُشی کی رسم کا بھی ذکر کیا ہے۔ عرب اپنی اولاد کو قتل کرنا جرم نہیں سمجھتے تھے ،وہ اس قدر سنگ دل تھے کہ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ مصنف نے یہاں نبی پاک ﷺ کی تعلیمات سے اس سنگین مجرمانہ فعل کے خاتمے کو سورۃ تکویر کی آیت نمبر کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ "اور جس دن زندہ دفن کی جانے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ میں ماری گئی۔"(۹۰) رسول اللہؐ نے خود چار بیٹیوں کی پرورش کر کے عرب معاشرے میں بیٹی کے مقام و مرتبے کو بلند فرمایا اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل کرنے سے روکا۔

سید سلیمان ندوی نے عرب معاشرت میں موجود طبقاتی تفاوت اور عورتوں، غلاموں کے ساتھ روا انسانیت سوز رویے کی جانب کنایتاً اشارہ کر کے اسلام کی نظر میں سب کے برابر ہونے اور انسانی جان کی قدر و قیمت کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے "عورتوں کو جو حقوق پیغامِ محمدیؐ نے دیے ہیں اور غلاموں کو جس حد تک اس نے عزت دی ہے۔ جی چاہتا تھا کہ اس کو بھی تمھارے سامنے پھیلاوں اور دکھاوں کہ یورپ باایں ہمہ دعوائے بلندی ہنوز اسلام کے اوجِ خیال سے نیچے ہے مگر افسوس کہ وقت نہیں"۔(۹۱)

سید سلیمان ندوی نے عرب کی معاشرت کے چند نکات اور ان میں پیغامِ محمدیؐ کی وجہ سے ہونے والی انقلاب انگیز تبدیلیوں کو ذکر کیا ہے۔ وہ حضورؐ کے لائی ہوئی تعلیمات کا یورپ سے تقابل کرتے ہوئے، ان کی برتری اور اہلِ یورپ کے اخلاقی زوال کو اشاراتاً بیان کرتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد پیغامِ محمد کی اہمیت اور ہمہ گیریت کو نمایاں کرنا ہے۔ خطباتِ مدراس چوں کہ حیاتِ محمد کے مطالعہ کی اہمیت اور اس کی انفرادیت کا اظہاریہ ہے، اس لیے اس میں جغرافیہ و تہذیب و معاشرت کو الگ سے بطور موضوع بیان کرنے کی مصنف نے ضرورت محسوس نہیں کی۔

۵۔ سیرت رسول اللہ ﷺ:

سید نواب علی نے سیرت رسول اللہ میں مکہ کے جغرافیہ کو "خدائے ابراہیم کے دو گھر" کے عنوان سے بیان کیا ہے ۔ جغرافیہ کے بیان میں وہ توریت سے حوالے دیتے ہیں اور بنی اسرائیل کے انبیا کا بھی ذکر کرتے تھے۔ انھوں نے حضرت اسماعیلؑ کے بعد حضرت اسحاقؑ کی ولادت کا ذکر کیا ہے۔ جس کے بعد سگے، سوتیلے اور خاندانی جھگڑوں نے حضرت ابراہیمؑ کو پریشان کیا اور وہ حضرت ہاجرہؑ کو دور ایک مقام پر لے گئے۔ سید نواب حضرت سارہؑ کے اس مطالبے کا ذکر نہیں کرتے جو انھوں نے حضرت ابراہیمؑ سے کیا تھا کہ ہاجرہؑ اور اس کے فرزند کو یہاں سے نکال دیا جائے۔ وہ توریت کتاب پیدائش باب ۲۱ سے حوالے دیتے ہیں: "جب بیابان میں پھرتے ہوئے حضرت اسمٰعیل تشنگی سے قریب المرگ ہو گئے تو خدا نے ہاجرہ کو بشارت دی۔ ان کو وہاں ایک چشمہ نظر آیا اور وہ دونوں وہیں آباد ہو گئے۔"(۹۲) اس آیت کو درج کرنے کے بعد سید نواب نے توریت کا اصل متن عبرانی اور اس کا اردو ترجمہ درج کیا ہے۔

اور خدا لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑا ہوا اور بیابان میں تیر انداز ہوا اور
فاران کے بیابان میں رہنے لگا۔[۹۲]

سید نواب علی نے یہاں لفظ فاران سے بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مدبر فاران کا ترجمہ بیابانِ فاران کیا جاتا ہے لیکن اصل عبرانی میں مدبر کے معنی وہی ہیں جو قرآن نے بیان کیے ہیں یعنی "غیر ذی زرع" اور جس کی تصدیق اس عبرانی نسخہ توریت سے ہوتی ہے، جسے ولیم گرینفیلڈ نے مع حاشیہ کے سنہ ۱۸۴۳ء میں لندن میں شائع کیا۔اسی طرح توراۃ سامری کے عربی ترجمے میں جسے سنہ ۱۸۵۱ء میں آر کوئی ٹن نے شائع کیا، فاران کے آگے خطوط ہلالی میں "حجاز" کا لفظ لکھا ہے۔[۹۳] لفظ فاران کی بحث کے ساتھ ہی سید علی نے یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ جس طرح حضرت سارہؑ نے حضرت ہاجرہ کو مع اولاد کے گھر سے نکال دیا، اسی طرح اہلِ کتاب توریت میں جہاں حضرت اسماعیلؑ اور ان کی ذریت کا ذکر آتا ہے، اس مقام پر جھگڑتے ہیں اور اس کو جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں مگر حق کبھی نہیں چھپتا، خواہ اس کو چھپانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کر لی جائے۔۹۴ حضرت اسماعیلؑ گو الگ آباد ہوئے مگر ان کا حضرت اسحاقؑ اور اپنے والد سے تعلق قائم رہا اور دونوں جانب آمد ورفت کا سلسلہ بر قرار رہا۔ دونوں بھائیوں نے مل کے حضرت ابراہیمؑ کو دفن کیا اور یعقوبؑ کے بڑے بھائی عیص ابن اسحاق نے اپنی چچازاد بہن بنتِ اسماعیل سے عقد کیا۔[۹۵]

جغرافیہ سیرت سے بحث کرتے ہوئے سید نواب علی حضرت اسماعیلؑ کے طریقِ عبادت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کا طریق عبادت حضرت ابراہیمؑ کی طرز پر ہی ہو گا البتہ انھوں نے یہاں ایک قربان گاہ اور معبد تعمیر کیا۔ بنی اسماعیل پہلے توریت کی تعلیمات پر قائم رہے، بعد میں وہ اس سے بے گانہ ہو کر اپنے قدیم طریق ابراہیمی پر قائم ہو گئے۔[۹۶] مصنف نے مؤرخینِ عرب کے حوالے سے لکھا ہے کہ جس مقام سے چشمہ نکلتا تھا اور جہاں حضرت اسماعیلؑ آباد تھے وہاں جرہم کا ایک قبیلہ آکر آباد ہو گیا اور اس کے سردار مضاض نے اپنی بیٹی حضرت اسماعیلؑ کے عقد میں دے دی۔ خدا کا گھر جو حضرت ابراہیم و اسماعیلؑ نے مل کر بنایا تھا وہ بانت ابنِ اسماعیل کی وفات کے بعد ان کے نانا مضاض کی تولیت میں آگیا اور یہی قبیلہ مدت تک اس پر قابض رہا۔

سید نواب علی خانہ کعبہ کی تولیت پر مزید روشنی نہیں ڈالتے کہ اس کو بنی اسماعیل نے کس طرح بنو جرہم سے واپس لیا اور اس کی تولیت قریش کے پاس کیسے آئی البتہ وہ شہر مکہ میں بیت الحرام کی موجودگی کو بیان کرتے ہوئے اس کی تجارتی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصود شہر کے نام کی بحث کو پیش کرنا ہے تاکہ تحقیق سے ثابت کیا جا سکے کہ یہ وہی شہر ہے، جہاں حضرت اسماعیلؑ آبسے تھے۔ وہ حضرت اسماعیلؑ کے بارہ بیٹوں کا ذکر کرتے ہیں، جن کو توریت میں "بارہ شاہزادے" کہا گیا ہے۔ ان میں سے نابت اور قیدار مشہور ہیں۔ جن کی آل اولاد عرب کے مختلف صوبوں حجاز، یمن، نجد

وغیرہ میں برسرِ اقتدار آئی۔ یہ لوگ اپنے معبد "بیت الحرام" سے دور تھے مگر اس کی کشش انھیں کھینچ لاتی تھی۔ اسی وجہ سے موسمِ حج میں دور دراز سے زائرین قربانی کے جانوروں کے ساتھ آتے اور اپنے دادا ابراہیمؑ کی طرح خدا کو پکارتے یعنی "لبیک لبیک" کہتے۔ یہ معبد جسے بیت الحرام اور بیت اللہ کہا جاتا تھا، نہ صرف بنی اسماعیل کا مذہبی مرکز تھا بلکہ اقوامِ عرب نے بھی اس کو اپنا قومی معبد قرار دیا، اس کے گرد ایک شہر بھی آباد ہو گیا جو نہ صرف بیت اللہ کی وجہ سے مرکزیت رکھتا تھا بلکہ شام، یمن اور مصر کے کاروانِ تجارت کی گذر گاہ ہونے کی وجہ سے بھی اہمیت رکھتا تھا۔ اس شہر کو بکہ کہتے تھے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر اس طور آیا ہے۔ "بے شک سب سے پہلے جو گھر لوگوں کی عبادت کے لیے بنایا گیا وہی ہے جو بکہ میں ہے۔ برکت والا اور سارے جہاں کو ہدایت کرنے والا۔"(۹۷)

جغرافیہ سیرت کے بیان میں سید نواب علی نے تحقیق سے کام لیا ہے مگر اس ضمن میں وہ کسی مستشرق کا ذکر نہیں کرتے حالاں کہ سیرت کے جغرافیہ پر مستشرقین کے اعتراضات موجود ہیں مگر اس ضمن میں کسی اعتراض کو نواب علی نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ وہ تحقیقی انداز میں توریت اور قرآن کی روشنی میں لفظ "بکہ" کی تفہیم و تشریح کرتے ہیں اور بکہ کو مکہ کا ہی قدیم نام قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے تحقیقِ بکہ کے عنوان سے ایک شہ سُرخی قائم کی ہے۔ طبری نے بکہ کی وجہ تسمیہ سمیت البکہ بفعل المزدحمین لکھی ہے یعنی چوں کہ وہاں طواف کے لیے لوگوں کا اژدہام ہوتا تھا۔ اس لیے اس کو بکہ کہتے تھے۔ ابنِ ہشام نے ابو عبیدہ سے یہی قول نقل کیا ہے۔ "بکہ بطنِ مکہ کا نام ہے، اس لیے کہ اس میں لوگوں کا اژدہام ہوتا ہے۔" تفسیر صافی میں یہی روایت امام جعفر صادق اپنے والد امام باقرؒ سے روایت کرتے ہیں۔ "عورتیں معابد میں داخل نہیں ہوتی تھیں لیکن یہاں یہ بندش نہ تھی، اس لیے مکہ کو بکہ کہتے تھے۔"(۹۸)

یہاں سید نواب علی نے لفظ 'بکہ' پر تفصیلی بحث کی ہے کیوں کہ اس لفظ کی درست تفہیم کا تعلق جغرافیہ سیرت سے ہے۔ اگر سیرت کی کتابوں میں اس کی وضاحت نہ کی جائے تو مستشرقین کے اعتراضات کو ہوا ملتی ہے۔ ویسے بھی اہلِ کتاب نے حضورؐ کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے ان کے نسب اور جغرافیہ کی درست معلومات کو بگاڑنے میں اہم کردار ادا کیا۔ سید نواب علی لکھتے ہیں کہ زبور کے ایک نغمے میں بکہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اہلِ کتاب کو یہ گوارا نہیں تھا کہ ذریتِ اسماعیل کی عبادت گاہ کو اہمیت ملے، اس لیے انھوں نے جغرافیہ ہی بدل دیا اور بکہ کو ارضِ فلسطین کا حصہ قرار دے دیا اور سامرئیین نے اس کو کوہ جرزیم اور یہود نے قدس کی پہاڑی کے پاس اس کی موجودگی کو ظاہر کیا۔ نصاریٰ نے حادثہ صلیب کی یاد میں اس کو بُکا بمعنی رونا سمجھ لیا۔ قرآن مجید نے چھٹی صدی عیسوی میں اہلِ کتاب کے مقابلے جو بیت المقدس کے سوا کسی مقام کو قبلہ نہیں مانتے تھے۔ نغمہ زبور کو پیشِ نظر رکھ کر اعلان کیا کہ سب سے پہلا گھر بکہ میں تھا۔ جسے بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ نے خدائے واحد کی عبادت کے لیے بنایا تھا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے "اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں (ان میں سے ایک) مقامِ ابراہیم ہے اور جو شخص اس کے اندر آئے اس کو امن مل جاتا ہے۔"(۹۹)

سید نواب علی نے لفظ بکہ کے حوالے سے اہلِ کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اہلِ کتاب نے اس لفظ کے جس قدر ترجمے کیے 'ان میں "بُکا" کو رونے کے معنی میں لیا یا ایک ایسی وادی مراد لیا، جہاں روتا ہوا درخت یعنی بلساں پیدا ہوتا ہے جو فلسطین میں پایا جاتا ہے اور اس پر لطف کی بات یہ ہے کہ مستشرقینِ یورپ جن کو تحقیق کا بڑا دعویٰ ہے وہ بھی اسی خیال پر قائم ہے لیکن کوپن ہیگن یونی ورسٹی کے مشہور پروفیسر بُہل جو سامی زبانوں کے مستند ماہر ہیں، نے تازہ جوئش انسائیکلوپیڈیا میں بکہ کے متعلق اپنے نقطہ نظر کو بیان کیا ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

> بُکا ایک وادی ہے جا کا ذکر زبور نغمہ ۸۴ آیت ۷ میں ہے چوں کہ اس کے متعلق وہاں یہ لکھا ہے کہ زائرین اس کو کنوؤں کی سرزمین بتاتے ہیں۔ اس لیے قدیم مترجمین نے بکا کے معنی "رونے کی وادی" لکھ دیے حالاں کہ اس کے معنی ایسی وادی ہیں جہاں پانی نہ ملتا ہو، اس آخر الذکر معنی کی تائید کتاب دوم صموئیل ۵/۲۳ اور کتاب اول تاریخ الایام ۱۴/۱۴ سے ہوتی ہے۔ جہاں یہی لفظ بصیغہ جمع ایک ایسے درخت کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جو بلساں سے مشابہ ہے۔ اس لیے یہ قیاس کیا گیا کہ ایسے درخت کے لیے ایسی وادی ہونا چاہیے جو خشک ہو۔ کونگ نے بکا کو عربی بکا سے ماخوذ سمجھا ہے اور اس کا ترجمہ ایک مقام جہاں پانی نایاب ہو' کیا ہے۔ بظاہر صاحبِ زبور کے خیال میں ایک ایسی وادی تھی جس کے قدرتی منظر کے لحاظ سے یہ نام اختیار کیا گیا ہے۔(۱۰۰)

سید نواب علی نے تعمیرِ بیت المقدس کو بیت الحرام سے منسوب کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت داؤدؑ صموئیل کو دفن کرنے کے بعد فاران کے بیابان میں چلے گئے۔ اس زمانے میں آپ تخت نشین نہیں ہوئے تھے اور شاہ طالوت کی مخالفت کے باعث جابجا روپوش ہوتے تھے۔ فاران میں قیام کے دوران آپ نے دیکھا کہ بنی اسماعیل اور قبائلِ عرب ایک ہی مذہبی مرکز پر جمع ہوتے تھے، جس میں اتحاد و اتفاق کی فضا دیکھنے کو ملتی تھی۔ اس صورت حال کو دیکھ کر حضرت داؤدؑ بہت متاثر ہوئے اور جب وہ فلسطین میں واپس آکر تخت نشین ہوئے تو انھوں نے بنی اسرائیل کو متفقہ طور پر ایک ہی مذہبی مرکز پر لانے کی کوشش کی اور بیت المقدس کی تعمیر کا ارادہ کیا۔ وہ اپنی زندگی میں اس ارادے کو پورا نہ کر سکے مگر انھوں نے حضرت سلیمانؑ کو اس کی تعمیر کی وصیت کی، جو انھوں نے پوری کی۔(۱۰۱) سید نواب علی نے یہ ثابت کرنے کی مکمل کوشش کی ہے کہ لفظ بکہ "بُکا" یعنی رونا نہیں بلکہ اس سے مراد مکہ شہر ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں آخری نبی محمد رسول اللہ پیدا ہوئے، جو بنی اسماعیل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس شہر کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے خدائے واحد سے اس کا اول گھر تعمیر کرتے ہوئے جو دعا مانگی تھی، وہ قرآن مجید میں محفوظ ہے اور سید نواب علی نے اس کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ جس کا

ترجمہ یہ ہے۔ "پروردگار! ہمارے انہیں میں سے ایک پیغمبر بھیج 'جو تیری آیتیں پڑھ کر ان کو سنائے اور کتاب و حکمت ان کو سکھائے اور شرک سے ان کو پاک کرے۔ بے شک تو زبردست ہے حکمت والا۔"(۱۰۲)

سیرت رسول اللہ میں سید نواب علی نے جغرافیہ سیرت کے بیان میں اختصار سے کام لیا ہے۔ انھوں نے شہر مکہ کے گرد و اطراف میں موجود شہروں یا اس کے جغرافیہ کو صراحتاً بیان کرنے کے بجائے اس کے قدیم نام "بکہ" کی تفہیم و تشریح کو زیادہ ضروری سمجھا۔ اسی وجہ سے کتاب کے شروع میں تحقیقِ بکہ کی بحث موجود ہے۔ وہ توریت اور قرآن کے حوالوں سے اس شہر میں آمدِ اسماعیلؑ اور ان کی سکونت کو ثابت کرتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد حضورؐ کی ذات پر اٹھنے والے اس اعتراض کا سدِباب کرنا تھا کہ وہ ذریتِ اسماعیلؑ سے نہیں تھے۔ گو سید نواب علی نے اس جانب اشارہ نہیں کیا کہ وہ کسی اعتراض کا جواب تحریر کر رہے ہیں مگر ان کا اندازِ تحقیق و جرح اس امر کی غمازی کرتا ہے۔

سید نواب علی نے سیرت رسول اللہ میں سیرت کے تہذیبی و معاشرتی عوامل کا الگ سے مطالعہ نہیں کیا اور نہ ہی انھوں نے حضورؐ کی بعثت سے قبل مکہ کی سماجی اور مذہبی صورت حال پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے سیرت کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے کہیں کہیں عرب کی طرزِ معاشرت پر نکتہ زنی کی ہے اور ساتھ ہی تعلیماتِ محمدؐ کی وجہ سے ان میں ہونے والی مثبت تبدیلیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ یوں عرب کا تہذیبی و معاشرتی مطالعہ پیغامِ مصطفیٰؐ کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ غزوات کے بیان میں مصنف نے عربوں کی اس وحشیانہ رسم کا حوالہ دیا ہے، جس میں جنگ کے دوران غلبہ پانے کی صورت میں دشمن کی لاشوں کو مثلہ کرنا، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا اور املاک کو نقصان پہنچانا تھا۔ ان کی یہ خرابیاں تعلیمِ محمدؐ کی وجہ سے دور ہوئیں۔ سید صاحب نے اس طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

> عرب میں اس وقت تک جہاں اور بہت سے وحشیانہ افعال جنگ و جدال اور قتل و غارت رائج تھے، وہاں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ غفلت یا نیند کی حالت میں دشمن کو قتل کر دیتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، جیسے جاہلیت میں تابط شرا کے واقعات۔ اس قسم کی عادات شراب خوری کی طرح بتدریج تعلیم نبوی سے دور ہوئیں، مثلاً دشمن کی لاش کا مثلہ کرنا، عورتوں اور بچوں کا قتل، اعضا کاٹ کاٹ کر ہلاک کرنا، آگ میں جلانا، وغیرہ وغیرہ۔(۱۰۳)

عرب کی معاشرت میں غلامی کی رسم بھی شامل تھی۔ عرب میں یہود و نصاریٰ، صائبین اور مشرکین سب ہی آباد تھے۔ عہدِ جاہلیت سے ان میں رسمِ غلامی موجود تھی، وہ اسیرانِ جنگ کو غلام بنا لیتے تھے اور پھر ان سے انسانیت سوز سلوک روا رکھتے تھے، یہاں تک کہ وہ خود بھی اخلاقی سطح سے گر جاتے تھے۔ مکہ میں لونڈیوں اور غلاموں کی خرید و فروخت کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور انسانوں کی بھی منڈیاں لگتی تھیں، جہاں ان کو مال کی طرح خریدا اور بیچا جاتا تھا۔ سید

نواب علی نے عرب میں رسمِ غلامی کو بیان کر کے تعلیماتِ رسولؐ سے اس کے خاتمے کو بیان کیا ہے۔ تعلیماتِ رسولؐ سے اس کا خاتمہ، مقالے کے اس باب سے تعلق نہیں رکھتا، اسے باب چہارم میں تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے۔

سیرت رسول اللہ میں سید نواب علی نے عرب میں رسمِ تبنیت کی تشریح کی ہے اور حضورؐ کے ذریعے اس کے ختم ہونے کے موضوع کو بھی بیان کیا ہے۔ اسی رسم کو بیان کرتے ہوئے وہ مکہ میں عورتوں کی حیثیت کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں مگر اس موضوع پر تفصیلی بحث نہیں کرتے۔ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے عرب کی تہذیب و معاشرت کا مطالعہ کرنے کے بجائے، سیرتِ طیبہ کی روشنی میں چند خصوصی موضوعات کو بیان کر دیا، جن کا تعلق مستشرقین کے اعتراضات سے ہے۔ مثلاً انھوں نے عربوں میں متبنّٰی کرنے کی رسم کو بیان کر کے حضورؐ کے ذریعے اس کے ختم ہونے کو بیان کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے تعددِ ازواج کا ذکر کر کے اسلام میں چار شادیوں کی حد کو بیان کیا ہے۔ رسمِ تبنیت اور عورتوں کی حیثیت پر سید نواب علی کا ایک اقتباس ذیل میں نقل کیا گیا ہے، جس سے ان کے اس نقطہ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔

> ہند، یونان اور چین کی قدیم اقوام میں تبنیت کی رسم اس عقیدے پر مبنی تھی کہ مردے کی کریا کرم کے لیے لازم ہے کہ اس کا بیٹا ہو، خواہ وہ صلبی ہو یا متبنّٰی، ورنہ اس کی روح مبتلائے اذیت رہے گی۔ اس عقیدے کے علاوہ ایک بات اور بھی تھی کہ جائداد اپنے ہی نامزد کو ملتی تھی۔ مشرکین میں یہ طریقہ غیر کو اپنے قبیلے میں شامل کرنے کی غرض سے تھا لیکن نہ اس مذہبی حیثیت سے جیسا کہ مذکورہ بالا اقوام میں رائج تھا۔ ان میں سوتیلی ماں کے ساتھ نکاح بھی جائز تھا اور دو حقیقی بہنیں بھی ایک ساتھ عقد میں لاتے تھے ،ان قبیح رسموں کو آنحضرتؐ نے موقوف فرمایا۔(۱۰۴)

سیرت رسول اللہ ﷺ میں سید نواب علی نے جغرافیہ عرب کو بیان کرتے ہوئے لفظ "بکہ" اور بیابان فاران میں حضرت ہاجرہؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کے سکونت پذیر ہونے کو توریت و انجیل سے ثابت کیا ہے تاکہ حضورؐ کے حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے ہونے پر مستشرقین جو اعتراضات عائد کرتے ہیں، ان کا سدِ باب ہو سکے۔ اسی کے ساتھ وہ عرب کی تہذیب و معاشرت کا تفصیلی جائزہ نہیں لیتے بلکہ اشارے کنائے میں اس کی جانب قاری کی توجہ مبذول کرتے ہیں اور حضورؐ کی تعلیمات کی وجہ سے عربوں کے معاشرے میں جو مثبت تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان کو بیان کرتے ہیں۔

نو آبادیاتی عہد میں لکھی جانے والی کتبِ سیرت محض عقیدت و محبت کا اظہاریہ نہیں تھیں بلکہ ان میں حیاتِ محمد ﷺ کا دفاع قلم کے ذریعہ کیا گیا۔ سر سید احمد خان نے سب سے پہلے سیرتِ رسول ﷺ کے بیان میں جغرافیائی ماحول اور

تہذیبی و معاشرتی حالات کو صراحتاً موضوع بنانے کی ضرورت کو سمجھا اور خطباتِ احمدیہ میں پورا ایک باب جغرافیہ سیرت پر لکھا، جس کو علاحدہ سے ایک کتاب بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ سر سید نے اردو سیرت نگاری میں جس نئے منہج کا اضافہ کیا۔ اس کو نو آبادیاتی عہد کے سیرت نگاروں نے بخوبی نبھانے کی کوشش کی۔ یہ الگ بات ہے کہ جغرافیہ سیرت سے متعلق جو تفصیل اور مباحث سر سید کے یہاں موجود ہیں، وہ دیگر نو آبادیاتی کتبِ سیرت میں ناپید ہیں۔ سیرت نگاروں نے جغرافیائی ماحول اور تہذیب و معاشرتِ عرب کا مطالعہ ضرور کیا ہے لیکن ان کی حیثیت تمہیدی نوعیت کی ہے۔ انھوں نے سر سید کی طرح اس کو الگ سے موضوع نہیں بنایا بل کہ سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کے تناظر میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔

سیرت نویسی میں جغرافیہ سیرت کے بیان سے عرب کے ماحول، وہاں کے حصولِ معاش کے ذرائع سے متعلق معلومات کو درج کیا گیا اور اسی کے ساتھ اسلام سے قبل عرب کی تہذیبی و معاشرتی صورت حال کی عکاسی نے سیرتِ نبوی ﷺ کے پس منظر کو سمجھنے میں مدد دی۔ اہلِ یورپ نے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کو کم تر ثابت کرنے کی جو کوشش کی تھی، اس کی نفی کے لیے سیرت نگاروں نے حیاتِ محمد ﷺ کے تناظر میں یہ نقشہ کھینچنے کی سعی کی کہ آپؐ کی بعثت سے قبل عرب اور پوری دنیا مجموعی طور پر زوال پذیر تھی۔ آپؐ کی تعلیمات اور عملی نمونہ کی وجہ سے اخلاقی زوال عروج میں تبدیل ہوا اور عرب سمیت پوری دنیا میں انسانیت اپنا وقار بحال کرنے میں کامیاب ہوئی۔

حوالہ جات

۱۔ ایڈورڈ سعید، شرق شناسی، مترجمہ 'محمد عباس اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص ۲۳۵

۲۔ ایضاً، ص ۸

۳۔ سر سید احمد خان، سیرتِ محمدی، مرتبہ 'پروفیسر رفیع اللہ شہاب، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء، ص ۸۶، ۸۵

۴۔ ایضاً، ص ۹۱

۵۔ ایضاً، ص ۹۱

۶۔ ایضاً، ص ۹۰

۷۔ ایضاً، ص ۹۱

۸۔ ایضاً، ص ۹۲

۹۔ ایضاً، ص ۹۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۹۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۴۳

۱۶۔ عبید اللہ کوٹی ندوی، "مقالات سر سید احمد خان اور مستشرقین" مشمولہ سیرت النبی ﷺ اور مستشرقین، مرتبہ' حافظ عبد الغفار، لاہور: دار النوادر ۲۰۱۵، ص ۲۳۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۳۳

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۳۴

۱۹۔ سر سید احمد خان، ص ۱۴۷

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۴۷

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۴۸

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۴۸

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۵۴

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۵۴

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۵۵، ۱۵۴

۲۸۔ ایضاً، ص ۹۵

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۸۷

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۸۸

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۹۰، ۱۸۹

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۹۰

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۹۸

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۹۸

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۹۹

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۹۹

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۹۹

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۹۱

۳۹۔ ایضاً، ص۱۹۱

۴۰۔ ایضاً، ص۱۹۳

۴۱۔ ایضاً، ص۱۹۵

۴۲۔ ایضاً، ص۲۰۰

۴۳۔ ایضاً، ص۱۹۷

۴۴۔ قاضی سلیمان سلمان منصور پوری، رحمتہ للعالمین (لاہور: عبداللہ اکیڈمی، ۲۰۱۲) ص۵۱

۴۵۔ ایضاً، ص۵۱

۴۶۔ ایضاً، ص۴۹

۴۷۔ ایضاً، ص۴۹

۴۸۔ ایضاً، ص۴۹

۴۹۔ ایضاً، ص۵۰

۵۰۔ ایضاً، ص۵۰

۵۱۔ ایضاً، ص۷۰، ۶۹

۵۲۔ ایضاً، ص۷۰

۵۳۔ علامہ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی ﷺ (ج:اول) (لاہور: الفیصل ناشران، س۔ن) ص۶۸

۵۴۔ ایضاً، ص۶۸

۵۵۔ ایضاً، ص۶۹

۵۶۔ ایضاً، ص۸۴

۵۷۔ ایضاً، ص۸۵

۵۸۔ ایضاً، ص۸۵

۵۹۔ ایضاً، ص۸۵

۶۰۔ ایضاً، ص۸۵

۶۱۔ ایضاً، ص۸۶

۶۲۔ ایضاً، ص۸۷

۶۳۔ ایضاً، ص۸۹

۶۴۔ ایضاً، ص۹۰

۶۵۔ ایضاً، ص۹۰

۶۶۔ ایضاً، ص۹۰

۶۷۔ ایضاً، ص۹۵

۶۸۔ ایضاً، ص۹۵

۶۹۔ ایضاً، ص۹۵

۷۰۔ ایضاً، ص۹۷

۷۱۔ ایضاً، ص۹۷

۷۲۔ ایضاً، ص۹۷

۷۳۔ ایضاً، ص۶۹

۷۴۔ ایضاً، ص۷۰

۷۵۔ ایضاً، ص۷۲

۷۶۔ ایضاً، ص۷۲

۷۷۔ ایضاً، ص۷۲

۷۸۔ ایضاً، ص۷۳، ۷۲

۷۹۔ ایضاً، ص۷۳

۸۰۔ ایضاً، ص۷۳

۸۱۔ ایضاً، ص۷۴

۸۲۔ ایضاً، ص۷۴

۸۳۔ ایضاً، ص۷۴

۸۴۔ ایضاً، ص۷۶، ۷۵

۸۵۔ ایضاً، ص۷۶

۸۶۔ ایضاً، ص۷۸

۸۷۔ ایضاً، ص۸۱

۸۸۔ ایضاً، ص۸۲، ۸۱

۸۹۔ سید سلیمان ندوی، خطباتِ مدراس (لاہور: ادارہ اسلامیات، ۱۹۸۳ء) ص۱۵۹

۹۰۔ ایضاً، ص۱۶۱

۹۱۔ ایضاً، ص۱۶۴

۹۲۔ سید نواب علی، سیرت رسول اللہ ﷺ (کراچی؛ مکتبہ افکار، ۱۹۶۶ء) ص۵۷

۹۳۔ ایضاً، ص۵۷

۹۴۔ ایضاً، ص۵۸

۹۵۔ ایضاً، ص۵۸

۹۶۔ ایضاً، ص۵۸

۹۷۔ ایضاً، ص۵۹

۹۸۔ ایضاً، ص۶۱

۹۹۔ ایضاً، ص۶۲

۱۰۰۔ ایضاً، ص۶۲

۱۰۱۔ ایضاً، ص۶۴

۱۰۲۔ ایضاً، ص۶۷

۱۰۳۔ ایضاً، ص۲۵۲

۱۰۴۔ ایضاً، ص۲۶۶

References:

1. Edward Said, Sharq Shanasi, Translated by Mohammad Abbas, Islamabad: Muqtadra Qaumi Zaban Pakistan, 2012, p. 235
2. Ibid., p. 8
3. Sir Syed Ahmed Khan, Seerat-e-Muhammadi, Edited by Professor Rafiullah Shehab, Lahore: Maqbool Academy, 1988, pp. 85, 86
4. Ibid., p. 91
5. Ibid., p. 91
6. Ibid., p. 90
7. Ibid., p. 91
8. Ibid., p. 92
9. Ibid., p. 92
10. Ibid., p. 93
11. Ibid., p. 141
12. Ibid., p. 141
13. Ibid., p. 142
14. Ibid., p. 142
15. Ibid., p. 143
16. Obaidullah Koti Nadvi, "Maqalat-e-Sir Syed Ahmed Khan aur Mustashriqeen" in Seerat-un-Nabiﷺ aur Mustashriqeen, Edited by Hafiz Abdul Ghaffar, Lahore: Dar-ul-Nawadir, 2015, p. 233
17. Ibid., p. 233

18. Ibid., p. 234
19. Sir Syed Ahmed Khan, **Op. cit.**, p. 147
20. Ibid., p. 147
21. Ibid., p. 148
22. Ibid., p. 148
23. Ibid., p. 153
24. Ibid., p. 153
25. Ibid., p. 154
26. Ibid., p. 154
27. Ibid., pp. 154, 155
28. Ibid., p. 95
29. Ibid., p. 187
30. Ibid., p. 188
31. Ibid., pp. 189, 190
32. Ibid., p. 190
33. Ibid., p. 198
34. Ibid., p. 198
35. Ibid., p. 199
36. Ibid., p. 199
37. Ibid., p. 199
38. Ibid., p. 191
39. Ibid., p. 191
40. Ibid., p. 193
41. Ibid., p. 195
42. Ibid., p. 200
43. Ibid., p. 197
44. Qazi Suleman Salman Mansoorpuri, Rehmat-ul-lil-Aalameen, Lahore: Abdullah Academy, 2012, p. 51
45. Ibid., p. 51
46. Ibid., p. 49
47. Ibid.,p. 49
48. Ibid., p. 49
49. Ibid., p. 50
50. Ibid., p. 50
51. Ibid., pp. 69, 70
52. Ibid., p. 70
53. Allama Shibli Nomani,Seerat-un-Nabiﷺ(Vol. 1), Lahore: Al-Faisal Nashran, (n.d.), p. 68
54. Ibid., p. 68
55. Ibid., p. 69
56. Ibid., p. 84
57. Ibid., p. 85
58. Ibid., p. 85
59. Ibid., p. 85
60. Ibid., p. 85
61. Ibid., p. 86
62. Ibid., p. 87

63. Ibid., p. 89
64. Ibid., p. 90
65. Ibid., p. 90
66. Ibid., p. 90
67. Ibid., p. 95
68. Ibid., p. 95
69. Ibid., p. 95
70. Ibid., p. 97
71. Ibid., p. 97
72. Ibid., p. 97
73. Ibid., p. 69
74. Ibid., p. 70
75. Ibid., p. 72
76. Ibid., p. 72
77. Ibid., p. 72
78. Ibid., pp. 72, 73
79. Ibid., p. 73
80. Ibid., p. 73
81. Ibid., p. 74
82. Ibid., p. 74
83. Ibid., p. 74
84. Ibid., pp. 75, 76
85. Ibid., p. 76
86. Ibid., p. 78
87. Ibid., p. 81
88. Ibid., pp. 81, 82
89. Syed Suleman Nadvi, Khutbat-e-Madras , Lahore: Idara-e-Islamiat, 1983, p. 159
90. Ibid., p. 161
91. Ibid., p. 164
92. Syed Nawab Ali, Seerat-e-Rasool Allah, Karachi: Maktaba-e-Afkar, 1966, p. 57
93. Ibid., p. 57
94. Ibid., p. 58
95. Ibid., p. 58
96. Ibid., p. 58
97. Ibid., p. 59
98. Ibid., p. 61
99. Ibid., p. 62
100. Ibid., p. 62
101. Ibid., p. 64
102. Ibid., p. 67
103. Ibid., p. 252
104. Ibid., p. 266